بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شرف النساء

حصّہ دوم

مصنّفہ

عنایت عارف

ناشر

المکتبۃ العلمیّہ - ۱۵ لیک روڈ - لاہور

قیمت مجلد ــــــــ ۵ روپے
باراول ــــــــ ایک ہزار

طابع و ناشر عبید الحق

مطبوعہ اردو پریس
لاہور

فہرست مضامین

انتساب

اپنی والدہ مرحومہ نواب بیگم کے نام
جن کی آغوش تربیت نے مجھے اپنوں اور
بیگانوں کے دیئے ہوئے غم سہنے کے
قابل بنایا۔

"جب کوئی شیر جنگل سے نکلتا ہے تو اس کی بابت
یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ نر ہے یا مادہ یعنی یہ بات
ضروری ہے کہ خواہ مرد ہے یا عورت، اطاعت و
تقوے میں معروف (ثابت قدم) ہو"

شیخ نظام الدین اولیاءؒ

(فوائد الفواد صہ۲۲)

کے خزانے سے انہیں کیا نکال کر دیتے ہیں اور ان کے لئے فکر و عمل کی کون سی شاہراہیں متعین کرتے ہیں؛ ہم ان کے سامنے ماضی کے جو نقوش پیش کریں گے اور حال کے جو شواہد ان کے سامنے رکھ کر مثالیں قائم کریں گے — ہماری پوری قوم کو اسی کا پھل ملے گا خواہ وہ کڑوا، کسیلا اور زہریلا ہو یا لذیذ و شیریں۔

میں نے اس کتاب کی تالیف کے وقت ہر ممکن کوشش کی ہے کہ پڑھنے والوں میں مشاہیر پرستی کے جذبات پیدا نہ ہوں بلکہ وہ ان حقائق کو سمجھنے کی کوشش کریں جن کی بدولت ان ہستیوں کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی اور پھر ہر قدم پر تکرار کے ساتھ یہ ذہن نشین کرانے کی سعی کی ہے کہ ہم یہ اوصاف اپنے اندر پیدا کر کے ان بلندیوں کو خود بھی اپنے قدموں پر سرنگوں کر سکتے ہیں۔

ان مقاصد کے غالب ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کہ میں سوانح نگاری کے جدید اصولوں کی مکمل طور پر پیروی کرنے میں کامیاب نہیں ہوا اور علمی زاویۂ نگاہ سے اسے صحیح معنوں میں سوانح کی کتاب کا درجہ نہیں دے سکا۔ مجھے اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کے ساتھ اس امر کا بھی پورا اعتراف ہے کہ میں بعض واقعات کی تحقیق اور چھان بین کے سلسلے میں حوالہ جات کی بھرمار اور بحث و تمحیص کا سہارا نہیں لے سکا تاہم میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ غیر مستند، بے بنیاد اور من گھڑت واقعات شامل نہ ہونے پائیں، میں نہیں کہہ سکتا کہ میری یہ کوشش کہاں تک کامیاب رہی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے حضرت سکینہ بنت حسین، حضرت عائشہ بنت طلحہ، رضیہ سلطانہ، ملکہ نور جہاں اور شہزادی زیب النساء وغیرہ کے سلسلے میں غیر ذمہ دار مورخین اور انگریز اور ہندو سیرت نگاروں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں اور الزام تراشیوں کی حقیقت ایسے انداز میں واضح کرنے کی کوشش ضرور کی ہے جو پڑھنے والوں کے اذہان پر بوجھ ثابت نہ ہو اور کسی غیر ضروری بحث کا دروازہ نہ کھل جائے۔ بعض مورخین نے سنے سنائے اور من گھڑت واقعات کا سہارا لے کر تاریخ کے نام پر ان عفت مآب ہستیوں کو اپنی قوم کی نگاہوں سے

گرانے کے لیئے ان کے کردار جس بری طرح سے مسخ کئے ہیں وہ تاریخ کے دامن پر ایک شرمناک داغ ہے۔ آج ضرورت ہے کہ ہمارے مؤرخ اور محقق تاریخی حقائق کی روشنی میں از سرِ نو ان کہانیوں اور افسانوں کا جائزہ لیں اور ہماری ان معزز و محترم پاکدامن خواتین کے حقیقی سیرت و کردار سے قوم کو آشنا کریں۔ بعض بزرگ حضرات نے اس کام کا آغاز کر دیا ہے اور کچھ تھوڑا بہت کام بھی ہوا ہے مگر وہ کافی نہیں۔ ابھی بہت زیادہ محنت اور تحقیق کی ضرورت ہے۔

مجھے یہ کتاب مرتب کرتے وقت جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے ان کی تفصیل بیان کر کے آپ کے لیئے بارِ خاطر بنا مقصود نہیں۔ صرف یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ خاص طور پر خلافتِ راشدہ کے بعد مخدراتِ اسلام اور مشہور مسلمان خواتین کے مستند سوانح حاصل کرنا گویا جوئے شیر لانا ہے کیونکہ مسلمان مورخین نے چند حکمران عورتوں اور سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والی خواتین کے علاوہ عام بلند کردار اور صاحب سیرت خواتین کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ کتبِ تواریخ و سیر میں کہیں کہیں ضمناً اور اشارۃً ان کا ذکر مل جاتا ہے وہ بھی نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ اس عدم توجہی کی ایک وجہ عورتوں کی جمود آفرین زندگی اور معاشرتی پابندیاں بھی ہو سکتی ہیں مگر سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ماضی میں مورخین کا زیادہ تعلق سیاسی عروج و زوال کی داستان اور حکمران شخصیتوں سے رہا ہے۔ جن لوگوں نے درباروں اور شاہی مجالس سے باہر جھانکنے کی جرأت بھی کی ہے۔ انہوں نے عموماً داستان گوئی سے آگے قدم نہیں بڑھایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ایک طرف تو ان خواتین کے مستند حالات جمع کرنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ دوسری طرف سیاسی شخصیتوں کے ہجوم میں اچھے برے لوگوں کا امتیاز بہت مشکل ہو جاتا ہے ان حالات میں مجھے جو کچھ قابلِ اعتماد نظر آیا ہے اور افادی لحاظ سے جن کا انتخاب میں نے موزوں خیال کیا ہے وہ پیشِ خدمت ہے انشاءاللہ میری کوشش اور جستجو کا سلسلہ بشرطِ زندگی قائم رہے گا اور میں کوشش کروں گا کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کتاب کی خامیوں اور نقائص کو

دور کرتا رہوں۔

میں نے عقائد و نظریات کے اختلافات اور تعصبات سے پہلو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور ہر قدم پر یہ خیال رکھا ہے کہ یہ کتاب مذہبی اختلافات، نظریاتی آویزشوں اور فرقہ وارانہ تعصبات سے بالکل پاک ہو کیونکہ میرے نزدیک یہ بات "شرف النساء" کی مقصدیت کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے میں پڑھنے والوں سے یہ امید رکھنے میں حق بجانب ہوں کہ وہ جہاں مجھے از راہِ کرم نیک مشوروں سے احسانمند فرمائیں گے وہاں اسے کسی مخصوص عقیدے یا نظریہ کی عینک سے پڑھ کر رائے قائم کرنے کی کوشش نہیں کریں گے بلکہ اسے ایک تبلیغی، اصلاحی اور تعمیری کوشش سمجھ کر مطالعہ فرمائیں گے۔

آپ اس کتاب میں یقیناً یہ کمی بھی محسوس کریں گے کہ یہ عصرِ حاضر کی مشہور اور اکابر خواتین کے ذکر سے خالی ہے۔ مجھے اس خلا کا خود بھی شدت سے احساس ہے مگر بعض دشواریوں اور مشکلات کی وجہ سے میں یہ کمی پوری نہیں کر سکا۔ آج کی کھوکھلی اور پراپیگنڈے کی دنیا میں کسی نیک مقصد کو سامنے رکھ کر صحیح معنوں میں انتخاب کا کام انجام دینا اور پھر اسے دیانتداری سے پایۂ تکمیل تک پہنچانا بہت مشکل ہے بالخصوص ہماری خواتین میں جس طرزِ فکر نے جڑ پکڑلی ہے اس کی موجودگی میں ہر لحاظ سے مفید اور اصلاحی کتاب تصنیف کرنا سر دست ایک کٹھن مرحلہ ہے بہر حال میں نے معلومات فراہم کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے امید ہے کہ مستقبل قریب میں "شرف النساء" کی تیسری جلد اس کمی کو پورا کر دے گی۔ وہ اس قابل ہو گی کہ ہماری آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کر سکیں۔ جہاں تک اس کتاب کے اندازِ بیان کا تعلق ہے: میں نے حتی کوشش کی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مؤثر، دلنشین اور دلچسپ بھی ہو تاکہ موجودہ دور میں جب کہ سہل انگاری اور ذہنی لذت پرستی کا مرض عام ہے اور تاریخ و سیر کو نصابی حیثیت سے پڑھنا بھی ذہنی مشقت سمجھا جاتا ہے ___ یہ کتاب ہماری خواتین کی نازک اور لطیف طبائع پر بار ثابت نہ ہو۔

یہ ناشکری ہوگی اگر میں اپنے کرم فرما جناب عبید الحق صاحب ندوی اور جناب ولی اللہ خاں صاحب سپرنٹنڈنٹ محکمہ آثار قدیمہ مغربی پاکستان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش نہ کروں کیونکہ انہوں نے اس کتاب کی ترتیب میں مجھے قابلِ قدر مدد دی ہے۔

ان کے علاوہ میں اپنے مخلص دوست جناب کوثر نیازی صاحب، قمر الدین صاحب ایم اے ڈاکٹر خالد محمود صاحب غزنوی، منظور انور قریشی صاحب، جناب رشید بخاری صاحب اسماعیل جلبی صاحب چوہدری علی محمد صاحب منیجر اردو پریس لاہور ڈاکٹر عبد الخالق صاحب، جناب سعادت خیالی صاحب، پروفیسر خالد بزمی صاحب ایم اے، جناب محی الدین صاحب فاضل عربی اور لفٹیننٹ اعجاز احمد فاروقی کا بھی ممنونِ احسان ہوں کہ ان کی گرانقدر آرا اور کتب خانوں سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے

اس سلسلے میں خاکسار جناب علامہ حافظ کفایت حسین صاحب اور حضرت مولانا عبد الحق صاحب عباس کا بھی شکر گزار ہے کہ انہوں نے بعض معاملات میں بڑے خلوص کے ساتھ میری راہنمائی کی ہے

بطورِ حرفِ آخر میں اس کتاب کے پڑھنے والوں سے التجا کرتا ہوں کہ اگر میرے کسی کرم فرما کو یہ کتاب پسند آئے تو وہ میری والدہ نواب بیگم مرحومہ کے لئے صدق دل سے دعائے خیر فرمائیں۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے گا۔ والسلام

دعاؤں کا طالب

عنایت عارف

۳۲ گورو تیغ بہادر روڈ۔ کرشن نگر۔ لاہور

یکم جون ۱۹۵۹ء

باب اوّل

قرۃ العین المرتضیٰ ؓ

حضرت زینب ؓ بنت علی کرم اللہ وجہہٗ

"جو شخص اس بات کی تمنا رکھتا ہو کہ وہ قیامت تک دنیا میں کسی دوسرے شخص کا محتاج نہ ہو تو اسے چاہیئے کہ ہمیشہ اللہ کی حمد و ثنا میں مصروف رہے۔"

(حضرت زینبؑ بنت علیؑ)

"میری پھوپھی نے سفر کربلا کی بے پناہ صعوبتوں اور مصائب میں بھی نوافل ترک نہیں کئے۔"

(حضرت امام زین العابدینؑ)

"آپ وہ ہیں جن کی گردنیں باطل کے آگے جھکنا نہیں جانتیں اور آپ وہ ہیں — صدق و صفا اور حق گوئی جن کی فطرت ہے۔"

(مکارم ابن کثیر)

"خدا کی قسم میں نے کسی پردہ نشین خاتون کو ان سے (حضرت زینبؑ) سے زیادہ فصیح البیان نہیں دیکھا۔"

(خزیمہ ابن اسدی)

حضرت زینب بنت علی المرتضےٰ کرم اللہ وجہہ

صدق و صفا، خوبی و کمال، صبر و رضا، زہد و اتقا، مہر و وفا، ایثار و قربانی کے بلند اوصاف کو اگر کسی ایک زندۂ جاوید شخصیت میں اپنے انتہائی عروج پر یک جا دیکھنے کی تمنا ہو تو ہزاروں مقدس پردوں کے اندر جلنے والی خاندانِ اہل بیت کی اس شمع کی تابانی میں دیکھئے جسے تاریخ زینبؓ بنت علیؓ بن ابی طالب کے نام سے یاد کرتی ہے۔

حضرت زینبؓ جن کی حیاتِ طیبہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیا، سیدۃ النساء حضرت فاطمہؓ کی عفت و عصمت، حضرت علیؓ کی فصاحت و بلاغت حضرت امام حسنؓ کی درویشی و سادگی اور حضرت امام حسینؓ کی حق پرستی اور صداقت شعاری سے عبارت تھی۔ پانچویں یا چھٹے ہجری سال میں پیدا ہوئیں بعض مورخین نے تاریخ ولادت ۹ھ بیان کی ہے۔ حیدر کرار حضرت علی المرتضےٰؓ آپ کے والد ماجد تھے، خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی بیٹی اور حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کی بہن تھیں

اس ہستی کی عظمت و رفعت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے جن کے نانا سرور کائنات شہنشاہ کونین، سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں۔ اور میلادِ سعید کے بعد حضورؐ نے اپنے لعابِ دہن سے ان کے حلق کو تر کیا ہو۔ جن کی نانی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ہوں جنہیں جبرائیل امین اللہ کا سلام پہنچانے کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ جنہیں سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراؓ ایسی ماں کا آغوشِ شفقت

نصیب رہا ہو جن کی نانی محترمہ اور والدہ مکرمہ کو یہ شرف نصیب ہو کہ ان کے اسوۂ حسنہ کو قیامت تک کے لئے نمونہ قرار دے کر یہ ہدایت کی گئی ہو کہ دنیا بھر کی مسلمان خواتین کے لئے ان کی تقلید کافی ہے جنہیں پیکر فقر و استغناء، علم کے بحر بے کراں اور شجاعت و بسالت کے روح رواں حضرت علیؓ ابن ابی طالب ایسے باپ کی محبت و شفقت نصیب ہوئی ہو۔ ان کی خوبیوں اور بلندیوں کو کون شمار کر سکتا ہے۔ جس مبارک ہستی نے ایسے پاک اور مقدس ماحول میں آنکھ کھولی ہو اور اس روحانی گردو پیش میں بچپن کی منزلیں طے کی ہوں ان کا دامن حیات بلند او صاف کے کیسے کیسے موتیوں اور جواہرات سے جگمگا رہا ہوگا۔ ذرا اس پاک گھرانے کا تصور کیجئے جس کی چار دیواری صبح و شام تلاوت قرآن پاک کی قدسی آواز سے گونج رہی ہو اور آواز بھی حضرت فاطمۃ الزہرا کی جو رات کی خاموشی اور تنہائی میں چکی پیسنے کی آواز کے زیر و بم کے ساتھ لپٹ کر عرش اعظم تک پہنچ رہی ہو۔ جس گھر کو صبر و رضا اور توکل و استغناء کے چراغوں نے بقعۂ نور بنا رکھا ہو، جہاں کئی کئی دن تک چولہے میں آگ روشن کرنے کی نوبت نہ آتی ہو۔ جس گھر کے دروازے کے باہر زر و جواہر کے ڈھیر پڑے ہوں مگر اندر کئی روز کا فاقہ ہو۔ اس کے باوجود جس گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے والا حاجت مند کبھی مایوس و نامراد واپس نہ گیا ہو۔ جس اسباب دنیا سے خالی سادہ اور فقیرانہ گھر پر کبھی عیش و عشرت اور فارغ البالی کا سایہ تک نہ پڑا ہو۔ مگر پھر بھی ایک عالم ہدایت و معرفت کی دولت سمیٹنے کے لئے اس گھر کے دروازے کے سامنے جھولی پھیلائے کھڑا ہو۔ جس گھر کے رہنے والوں نے اللہ کی حمد و ثنا اور تسبیح و تحمید کے علاوہ کبھی اور کوئی آواز نہ سنی ہو۔ جس گھر میں سرکار دو عالم محبوب کبریا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہروں بیٹھ کر انوار کا مینہ برساتے ہوں اور جس کے ہر ذرے نے آفتاب نبوت کی کرنوں سے ہم آغوش ہونے کا شرف حاصل کیا ہو۔ دنیا کا وہ

مبارک اور مثالی گھر جہاں دنیا کی ایک مثالی بیٹی، ایک فقید المثال بیوی اور بے نظیر ماں رہتی تھی جس کے پرتوِ انوار سے آج بھی نسائیت کے تقدس کا چراغ روشن ہے وہ صاحبِ کردار اور مخزنِ عظمت و جلالت ماں جس کا مقدس آغوش صداقت پر مرمٹنے، اللہ کے نام پر کٹ مرنے اور اسلام کی بلندی کے لئے ہر فرعون وہامان کے سامنے جراٗت و استقلال سے سینہ سپر ہو جانے کا درس دینے کے لئے ایک عظیم الشان مکتب کا کام دے رہا تھا۔ حضرت زینبؓ نے اسی مکتب میں فاطمۃ الزہرا کے فیضانِ نظر اور حضرت علی المرتضٰیؓ کی بسالت نگاہی کے سائے میں تربیت حاصل کی اور عظیم المرتبت بھائی حضرت امام حسینؓ کے ساتھ میدانِ کربلا کو اہل بیت کے مقدس خون سے لالہ زار بنتے دیکھا۔ اپنے بچوں کو قدسیت اور خدا پرستی کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے حضرت سیدۃ النساء کا اندازِ تربیت کیا تھا؛ اس کا اندازہ اسی ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت امام حسینؓ اور حضرت زینبؓ کی بچپن میں کسی بات پر تکرار ہو گئی جیسا کہ عام طور پر چھوٹے اور بڑے بہن بھائیوں میں ہو جاتی ہے حضرت فاطمۃ الزہرا نے انہیں اس حال میں دیکھا تو اپنے پاس بلا کر قرآن کی آیات سنائیں اور فرمایا کہ اس طرح آپس میں جھگڑ کر تم اللہ تعالیٰ کو ناراض کر رہے ہو۔ دونوں بچے قرآن سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے آئندہ کے لئے عہد کیا کہ کبھی ان سے ایسی کوئی بات سرزد نہ ہوگی جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہو۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے موقع پر حضرت زینب کی عمر سات برس سے کچھ کم تھی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے محبوبِ حقیقی سے ہم آغوش ہونے کے لئے دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو حضرت زینبؓ بھی اپنی والدہ مکرمہ کے ساتھ وہاں موجود تھیں۔ حضرت خاتونِ جنت نے بیٹی کی طرف دیکھ کر فرمایا: بیٹی! میں اپنے بابا کو ایسی حالت میں رخصت کر رہی ہوں جب کہ ہمارے

گھر میں جلانے کے لئے تیل بھی نہیں ہے" حضرت زینبؑ کی عمر ابھی سات سال سے کم ہی تھی کہ وہ اپنی بلند مرتبت ماں کے آغوشِ شفقت سے بھی محروم ہو گئیں۔ وفات سے پہلے سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراؑ نے حضرت زینبؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا "زینبؑ! میرے بعد اپنے بھائیوں کی ماں بھی تم ہے اور بہن بھی ـــــ اپنی ماں کی زندگی میں تو ہمیشہ بھائیوں سے بے پناہ محبت کرتی رہی ہے۔ میرے بعد بھی تمہاری محبت کا سلسلہ قائم رہنا چاہیئے اور تم سب ہمیشہ اسی طرح سلوک اور محبت کے ساتھ رہنا۔"

حضرت فاطمۃ الزہراؑ کے بعد حضرت علیؑ بن ابی طالب نے دوسری شادیاں کیں مگر ان کے گھر میں ایسا ماحول پیدا نہ ہوا جو عموماً سوتیلی ماؤں کے آنے سے ہو جاتا ہے بلکہ حضرت زینبؑ اپنی یتیمی کو رضائے الٰہی سمجھ کر ہمیشہ اسی راستے پر گامزن رہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کا راستہ تھا۔ ان کی بلند کرداری اور اعلیٰ اوصاف میں کوئی بات رکاوٹ کا موجب نہ بن سکی، اور ہمیشہ ایک سعادت مند، نیک اطوار اور دیندار بیٹی کی طرح انہوں نے اپنے فرائض سرانجام دیئے۔ اور حضرت علیؑ کی دوسری ازواج نے بھی پورے خلوص اور محبت کے ساتھ انہیں اپنے دامنِ شفقت میں اس طرح جگہ دی کہ جیسے لفظ "سوتیلی" ان کے نزدیک کفر کا ہم معنی اور عورتوں کے ایامِ جاہلیت کی مکروہ یادگار تھا جسے اسلام کی پاک تعلیم نے دوسرے مفاسد کی مانند مٹا دیا تھا۔

جب حضرت زینبؑ جوان ہوئیں تو خاندانِ نبوّت کا عکسِ جمیل تھیں، زندگی سر سے پاؤں تک سادگی کی تصویر، اخلاقِ کریمانہ کا حسین مجسّمہ، بڑوں کے ساتھ عزت و احترام اور بچوں کے ساتھ بے حد پیار و محبت سے پیش آنے کی عادی، شرم و حیا کا پیکر، گفتار و کردار میں وہی اسلامی عظمت، وقار اور متانت اور سیرت میں قدسیت کا جمال پنہاں تھا۔ بے حد مہمان نواز، خدا ترس اور حلیم و رحمدل تھیں۔ فیاضی اور سخاوت گویا

خاندانی وصف تھا۔ بے حد عبادت گزار اور ہر لحظہ خدا کے خوف سے ڈرنے والی تھیں۔ شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ کبھی حقیقی بھائیوں سے بھی آنکھ اٹھا کر بات نہیں کی۔ تقوےٰ و ریاضت میں اپنی مثال آپ، حق گوئی اور بے باکی میں مجاہدانہ سطوت و عظمت تھی۔ آپ کی شادی اپنے چچا زاد بھائی حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ سے ہوئی جو ہر لحاظ سے ان کے لئے موزوں اور مناسب تھے مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت زینبؓ کی شباہت حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے قدرے ملتی تھی۔ اللہ نے حسنِ سیرت کے ساتھ حسنِ صورت کی دولت بھی دل کھول کر دی تھی۔

/ حضرت زینبؓ کے والد ماجد حضرت علیؓ ابن ابی طالب اپنے دوسرے بیشمار اوصاف کے علاوہ عرب کے بہترین اور فصیح و بلیغ مقرر خیال کئے جاتے تھے اور ان کے کلام میں سحر بھرا ہوتا تھا ان کی بے نظیر اور عالمانہ تقریر ایک دفعہ تو سننے والوں کو مبہوت و مسحور کر دیتی تھی۔ یہی وصف حضرت زینبؓ کو نصیب ہوا تھا۔ ان کی یہ خصوصیت جہاں انہیں دوسری کئی مقدس خواتینِ اسلام سے ممتاز کرتی ہے۔ وہاں سیدنا حضرت علیؓ کا ہم وصف بھی بناتی ہے۔ حضرت زینبؓ نے میدان کربلا، کوفہ، دمشق اور یزید کے دربار میں جو خطبات ارشاد فرمائے تھے وہ آج بھی ہماری ملی تاریخ کا گراں قدر سرمایہ ہیں جن سے ان کی بے پناہ فصاحت و بلاغت، کلام کی روانی اور الفاظ کی نشست و برخاست پر قادر ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔

۳۷ھ میں جب حضرت علیؓ خلیفہ ہو کر کوفہ میں اقامت گزیں ہوئے تو حضرت زینبؓ اپنے شوہر حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ کے ساتھ وہاں مقیم تھیں۔ عام عورتوں کی طرح بے کار وقت ضائع کرنا تو ان کی عادت کے خلاف تھا۔ ان کا تمام وقت کن مشاغل میں صرف ہوتا تھا بناؤ سنگھار، طرح طرح کے ملبوسات بنانے اور پہننے، سیر و تفریح، دوسروں کی چغلیوں اور غیبتوں، نکتہ چینیوں اور عیب جوئی میں یا ذاتی

آرام و آسائش کے اسباب جمع کرنے میں ــــ ہرگز نہیں۔ یہ باتیں تو ان پاک ہستیوں سے کوسوں دور تھیں۔ وہ تو خیر حضرت زینبؑ بنت زہرؑا تھیں۔ ایک عام اور اوسط درجے کی مسلمان عورت بھی ان باتوں کو گناہ سمجھتی تھی۔ اور اسے جاہلیت سے تعبیر کرتی تھی۔ چہ جائیکہ سیدۃ النساء کی لخت جگر پر ایسی فضول باتوں کا سایہ تک پڑسکتا۔ ان کے مشاغل کیا تھے؟ غور سے سنیئے اور یاد رکھیئے ــــ یہ وہ ہستیاں تھیں جن کا جینا اور مرنا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لئے تھا۔ جن کی زندگیوں کا مقصدِ وحید یہ تھا کہ تمام دنیا میں اللہ کا نام بلند کیا جائے حق و صداقت کا بول بالا ہو۔ جہالت اور پستی کے اندھیرے دور ہوں۔ اور لوگ اسلام کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھیں۔ وہ خود قرآنی تعلیمات کی چلتی پھرتی تصویریں تھیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ دنیا میں ان کے آنے کا یہ مقصد نہیں کہ بہترین اور لذیذ ترین کھانے کھائیں، قیمتی سے قیمتی کپڑے پہنیں، گراں قیمت زیورات سے آراستہ ہوں اور دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ بلکہ وہ خوب سمجھتی تھیں کہ ایک بلند ترین نصب العین کی امانت سنبھالے ہوئے ہیں جس کے متعلق ان سے سوال کیا جائے گا۔ یہ نصب العین اسلام تھا جس کی بدولت دنیا میں مسلمانوں کو عزت و عظمت نصیب ہوئی تھی اور وہ مسلمان کہلائے تھے جس کے طفیل وہ قیصر و کسریٰ کی عظمت و شوکت کے وارث قرار پائے اور دنیا بھر کی دولت ان کے قدموں تلے پامال ہو رہی تھی۔ وہ اللہ کے اس احسانِ عظیم کو خوب سمجھتی تھیں۔ اور اس کا حق ادا کرنا اپنا فرض خیال کرتی تھیں۔ حضرت زینبؑ کو اللہ تعالےٰ نے خطابت اور تقریر کا ملکہ عطا فرمایا تھا اور ان کے کلام میں بے پناہ تاثیر پیدا کی تھی انہوں نے کوفہ کی مسلمان عورتوں کو جن میں نو مسلم خواتین کی بہت بڑی تعداد شامل تھی قرآن کی تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ وہ نمازِ فجر سے نمازِ ظہر تک

گھر کے فرائض ادا کرتی تھیں اور ظہر کی نماز کے بعد انتہائی فصیح و بلیغ زبان میں درسِ قرآن مجید دیتی تھیں یہ ان کے علم کی وسعت اور تقریر کی دلکشی تھی کہ ان کے درس میں روزانہ ہزاروں عورتیں شامل ہوتی تھیں۔ اور دین سے واقفیت حاصل کرتی تھیں۔ حضرت زینبؓ اپنے درس میں بعض اوقات بہت گہرے دینی اسرار بھی بیان کر جاتی تھیں۔ ایک دفعہ آپ حسبِ معمول درس دینے میں مصروف تھیں کہ اتفاق سے خلیفۃ المسلمین حضرت علیؓ تشریف لے آئے اور انہوں نے حضرت زینبؓ کی چند باتیں سن لیں۔ اسی وقت اپنی قابلِ فخر بیٹی کو بلا کر فرمایا کہ بیٹی! اسرارِ دین سے متعلق ایسے گہرے مسائل بیان نہ کیا کرو کیونکہ انہیں سمجھنے اور قبول کرنے کے لیئے بہت بڑی علمی استعداد اور قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ عورتوں کے سامنے درس دیتے وقت بھی نگاہیں جھکی رہتی تھیں تقوےٰ کی یہ حالت تھی کہ فرماتیں "دنیا کی زندگی اس سایہ دار درخت کی سی ہے جس کے سائے میں مسافر کچھ دیر کے لیئے سستا لیتے ہیں"۔ آپ کو تن آسانی اور آرام پسندی سے سخت نفرت تھی۔ وقت کا بیشتر حصہ عبادت میں بسر کرتی تھیں اور دن رات کثرت سے نوافل ادا کرنا ان کی عادت بن چکی تھی۔ اکثر روزے سے رہتی تھیں۔ اسی وجہ سے عابدہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ حضرت امام زین العابدین کا قول ہے

"میری پھوپی نے سفر کی مصیبتوں اور صعوبتوں میں بھی کبھی نوافل ترک نہیں کیئے ان کی اسی خصوصیت کی وجہ سے میدانِ کربلا میں حضرت امام حسینؓ نے ان سے فرمایا تھا۔ بہن! پچھلے پہر کے نوافل میں مجھے بھول نہ جانا"۔ ان کی زبان پر ہر وقت اللہ کی حمد و ثنا جاری رہتی تھی۔ وہ گھر میں ہوں یا سفر میں —— کسی بھی حالت میں ہوں ہر وقت تسبیح و تحمید میں مصروف رہنا ان کا شیوہ تھا۔ حضرت زینبؓ کا یہ

قتل بیعت نہیں ہے

جو شخص اس بیعت کے لئے تیار ہو کہ حقیقت سے منہ پھیر لے یا کسی دوسرے شخص
کا ساتھ دے تو وہ دوست سے الگ ہے جیسا کہ شرک کی مذمت میں مذکور ہے

تاریخ میں جب یزید نے حضرت امام حسینؓ سے اپنے ہاتھ پر تعاون اور بیعت کے
مطالبہ کو بار بار پیش کیا تو ان پر جان قربان کرنے والوں کا گروہ حضرت کے ساتھ ہو
اپنے ساتھیوں سمیت ... بعد حضرت امام حسینؓ نے تمام واقعات
کے متعلق ... اور ... بیعت کے اس رشتے اور ... کے
ہاتھ ... تعصبات ہر مسلمان
کو معلوم ہیں جب حضرت امام حسینؓ نے اپنے رفقاء کے ایک ایک فرد کو
قربان کر دیا۔ اپنے جانثاروں کے ہاتھ اٹھ جانے کی طرح دہکتی ہوئی ریت پر تڑپتے
دیکھے ننھے معصوم بچے کو پانی کے بجائے تیروں سے چھلنی ہوتے دیکھا اور آخر میں اپنا
سر مبارک بھی کٹوا دیا مگر یہ برداشت نہ کیا کہ ایک ظالم اور فاسق و فاجر بادشاہ کی اطاعت
قبول کریں۔ یزید پلید تھا اور اس کے دور کے حکام کی حکمرانی کرتا تھا اس لیے شہید کربلا
حضرت امام حسینؓ نے اسے مسلمانوں کا خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یزید کی
فوجوں نے امام حسینؓ شہید کے قافلے کو میدانِ کربلا میں گھیر لیا اور یزید کی اطاعت
قبول کرنے کے لئے مجبور کیا مگر آپ نے صاف انکار کر دیا تو یزیدی فوج کے
افسروں نے دریائے فرات پر پہرے بٹھا دیئے۔ کہ حضرت امام حسینؓ اور ان کے
ساتھیوں کو پانی کا ایک قطرہ نہ مل سکے۔ دوزخ کی طرح دہکتا ہوا ریگستان اور چلچلاتی
ہوئی دھوپ ـــ ایسی حالت میں حضرت امام حسینؓ کے حرم کی خواتین اور ننھے
ننھے بچے شدتِ پیاس سے بلکتے رہے۔ حلق سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ مگر آپ نے کسی قیمت
پر بھی دین کی عزت و عظمت کو فروخت کرنا گوارا نہ کیا بلکہ مجاہدانہ عزم و استقلال کے

۹۰۳۱

ساتھ اپنی بات پر قائم رہے۔ آخر جنگ شروع ہوئی تو چند دنوں میں حضرت امام حسینؓ کے تمام جان نثار ساتھی ایک ایک کر کے ان پر فدا ہو گئے۔ اور اس نازک موقع پر حضرت زینبؓ نے اپنے دونوں نوجوان بیٹوں حضرت عون اور حضرت محمد کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے اللہ کی راہ میں شہید ہونے کے لئے بھیجا اور انہیں آخر دم تک دادِ شجاعت دینے کی تاکید فرمائی۔ دونوں ہونہار بیٹے اپنی عظیم المرتبت ماں کے ارشاد کے مطابق لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور حضرت زینبؓ نے سجدۂ شکر ادا کیا۔

آخر میں حضرت امام حسینؓ کی باری تھی۔ حضرت امام علی بن حسینؓ جو امام زین العابدینؒ کے نام سے مشہور ہیں خیمے میں بیمار پڑے تھے وہ فرماتے ہیں کہ جس رات کی صبح کو حضرت امام حسینؓ میدانِ شہادت میں جانے والے تھے اس رات میں بیمار پڑا تھا اور میری پھوپی حضرت زینبؓ میری تیمار داری کر رہی تھیں۔ اس اثناء میں حضرت امام حسینؓ خیمے میں داخل ہوئے اور انہوں نے چند اشعار پڑھے جنہیں سن کر میں نے آپ کا ارادہ سمجھ لیا۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ نکلے کیونکہ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ہم پر مصیبت پوری طرح نازل ہو چکی ہے مگر حضرت زینبؓ ضبط نہ کر سکیں اور چلا اٹھیں۔ جب حضرت امام حسینؓ نے بہن کی یہ حالت دیکھی تو ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: "اے بہن! یہ کیا بے صبری ہے اور کیا رونا پیٹنا ہے؟ اللہ سے ڈرو کہ موت یقیناً آنے والی چیز ہے اور اس سے کوئی نہیں بچ سکتا" لیکن حضرت زینبؓ شدتِ غم سے نڈھال ہو رہی تھیں۔ کیونکہ ان کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ کل طلوع ہونے والی صبح کتنے خوفناک مظالم اپنے ساتھ لے کر آ رہی ہے۔ حضرت امام حسینؓ ان کی یہ حالت دیکھ کر خود آگے بڑھے اور ہوش میں لائے پھر فرمایا۔

"اے بہن! یہ کیا غم و حزن ہے جس کا اظہار تم کر رہی ہو، تمہیں چاہیئے کہ اللہ کے حکم کے مطابق جو طریق غم و حزن ہے اسے اختیار کرو کیونکہ میرے

لیئے اور ہر ایک مسلمان کے لیئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زندگی اور ان کے اعمال و افعال کی پیروی ایک بہترین نمونہ ہیں۔

مقام غور ہے کہ جس صابر و شاکر خاتون نے بڑے استقلال کے ساتھ یزیدی فوج کے بے پناہ جور و ستم کو برداشت کیا اور خود اپنے دونوں نوعمر بیٹوں کو اسلام کی عظمت اور صداقت پر قربان کر دیا اس کے ہاتھوں سے یک لخت صبر و شکیب کا دامن کیسے چھوٹ گیا۔ اگر ہم ایک لمحہ کے لیئے چشم تصور سے کربلا میں اہل بیت اور ان کے جان نثاروں پر ہونے والے مظالم کے خوفناک مناظر سامنے لائیں تو دل خون ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں ایک خاتون کا اس درجہ صبر و استقلال صرف ان ہی بزرگ ہستیوں کا حصہ ہو سکتا ہے جو دنیا میں دوسروں کے لیئے نمونہ بن کر آتی ہیں۔ حضرت زینبؓ کی ان اضطرابی کیفیات کا تعلق جہاں ایک طرف حضرت امام حسینؓ ایسے عظیم اور پیارے بھائی کی فطری محبت سے تھا تو دوسری طرف ان کے بے پایاں غم و اندوہ کا باعث یہ بھی تھا کہ امت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ایک عاقبت نا اندیش طبقہ اپنے ہاتھوں خاندان نبوت کا آخری چراغ گل کر دینے پر کمربستہ ہو چکا تھا۔ انہیں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ صبح رشد و ہدایت کا یہ روشن چراغ ہمیشہ کے لیئے گل کر دیا جائے گا اور اس کے بعد دنیا ئے حق و صداقت کو حضرت امام حسینؓ ایسا کارواں سالار پھر میسر نہ آسکے گا۔ ایک ایسے دور میں جب دنیائے اسلام پر یزید ایسے فاسق و فاجر خود ساختہ بادشاہ کا پرچم لہرا رہا تھا اور وہ ظالم اللہ اور رسولؐ کے نام پر اسلام کی بیخ کنی میں مصروف تھا۔ خزانوں اور دولت پر اس کا قبضہ تھا۔ ان گنت فوج ہر وقت اس کے اشارہ ابرو کی منتظر رہتی تھی اور کچھ نامی لوگ چند روزہ عیش و آرام کی خاطر اپنا ایمان اور ضمیر یزید کے پاس گروی رکھ چکے تھے۔ اسلام نے انسان کی عزت و عظمت اور شرف و آزادی کے لیئے جو مسند بچھائی تھی اس پر چند

ظالم اور جابر قبضہ جما چکے تھے۔ اور اسے باپ دادا کی میراث سمجھ کر مسلمانوں کے حقوق پائمال کر رہے تھے۔ جو لوگ آزادی کے ساتھ یزید کی مخالفت نہ کر سکتے تھے وہ گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر چکے تھے اور ہر طرف فتنہ و فساد کا دور دورہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ساری خدائی ایک دفعہ پھر حق و انصاف کے خلاف صف آرا ہو گئی ہے ایسے حالات میں حضرت امام حسینؓ اپنے مٹھی بھر جان نثاروں اور اصحاب کے ساتھ جو دنیائے اسلام کے لئے امید کی آخری کرن تھے اور یزید کے ظلم و ستم سے سہمی ہوئی ہزاروں آنکھیں امید بھری نگاہوں سے سیدنا حضرت امام حسینؓ کی طرف دیکھ رہی تھیں کیونکہ اس شر و فساد سے بھرپور ماحول میں صرف وہی حق و صداقت کی آواز بلند کر سکتے تھے اور اپنے نانا کے دین کی عظمت کو دنیا دار بھیڑیوں سے بچانے کے لئے ملت اسلامیہ کو ایک جھنڈے تلے جمع کر سکتے تھے مگر اس وقت تک حالات جو صورت اختیار کر چکے تھے اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ دنیائے اسلام کی یہ آخری امید اور آرزو بھی یاس و حرماں کے اندھیرے میں بہت جلد بدلنے والی ہے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہوتے حضرت زینبؓ کا حد سے بڑھا ہوا اضطراب کسی مزید تشریح کا محتاج نہیں۔

شہادت امام حسینؓ کے بعد حضرت زینبؓ نے مختلف مواقع پر جو خطبات ارشاد فرمائے ہیں ان کا ایک ایک لفظ ان کے خون جگر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ انہیں اسلام سے کس قدر والہانہ محبت تھی اور انہیں صورت حال کا کتنا شدید احساس تھا۔ ان کے زخمی دل کی ٹیسوں کو کچھ وہی محسوس کر سکتا ہے جسے سیدنا حضرت امام حسینؓ ایسے عظیم بھائی کی روحانی اور اخلاقی بلندیوں کا پورا احساس ہو جس کا دل غم کی زبوں حالی سے مجروح ہو چکا ہو۔

اگلے دن وہ منحوس صبح نمودار ہوئی جب اسلام کے بطل جلیل اور حریت و شجاعت کے شہنشاہ، نشانہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سوار ہونے والے کربلا کے غازی حق و آزادی

کے ایک درخشندہ ترین باب کو اپنے پاک خون سے لوحِ عالم پر لکھنے کے لئے میدانِ وغا میں نکلے تو تاریخ عالم حیرت کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ ایک طرف ایک جابر و قاہر خود ساختہ شہنشاہ کا لشکرِ عظیم تھا اور مقابلے میں پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھوکا پیاسا، پریشان حال اور غریب الوطن نواسا تھا جو تن تنہا اس سیلابِ ظلم وعدوان سے ٹکرانے کے لئے کھڑا تھا۔ تاریخ کی آنکھوں نے یہ منظر پہلی اور آخری بار دیکھا کہ ہزاروں تلواریں حق وصداقت کی اس ایک تلوار سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھیں۔۔۔ اس وقت بھی وہ ظلم وستم اور اللہ کی نافرمانی کے سامنے سر جھکا کر نہ صرف اپنی زندگی بچا سکتا تھا بلکہ ایک اشارۂ ابرو سے دنیا بھر کے عیش وآرام حاصل کر سکتا تھا۔ دنیاوی شوکت و حشمت کے حصول کے لئے اس کی ہر آرزو پوری ہو سکتی تھی۔ مطالبہ صرف اتنا تھا کہ وہ یزید کو خلیفہ تسلیم کرے۔ اس کے بعد خاندانِ نبوت کے لئے ہر بڑے سے بڑا اعزاز حاضر تھا۔ وہی ان گنت تلواریں جو حضرت امام حسینؓ کا مقدس خون چاٹنے کے لئے بجلی بن کر چاروں طرف لہرا رہی تھیں وہی ان کی حفاظت کے لئے سایہ بن جاتیں مگر وہ دل تو توحیدِ الٰہی کا پرستار تھا اور اس سر میں محبوبِ حقیقی کے عشق کا سودا سما چکا تھا۔ وہاں تو صداقت کی لاج کا سوال پیدا ہو چکا تھا اور اسلام کی عظمت ترازو کے ایک پلڑے میں تھی اور دوسرے میں دنیا اپنی تمام دلکشیوں اور رعنائیوں کے ساتھ خاتم النبیین رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے اور سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کے لختِ جگر کے فیصلے کی منتظر تھی۔ وہ اس شاہِ ذوسر (فداہ ابی وامی) کا نواسہ تھا جس نے اپنے مشفق و مہربان چچا کو فرمایا تھا کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج بھی رکھ دیا جائے تو میں حق وصداقت کی آواز بلند کرنے سے باز نہیں رہونگا دنیا کی دلکشی اور رعنائی ان کے پائے استقلال کو کیسے متزلزل کر سکتی تھی؟ حضرت امام حسینؓ نے تن تنہا پورے یزیدی لشکر اور ظالم فرمانروا کی حشمت وصولت کو میدانِ کربلا میں للکار کر

اپنے اٹل فیصلے کا اعلان کر دیا کہ وہ دنیا کے نہیں دین کے شیدائی ہیں۔ وہ شجاعت و دلیری سے لڑتے ہوئے کئی زخم کھا کر جامِ شہادت نوش فرما گئے۔ ایک ظالم کرنی نے آگے بڑھ کر ان کا سر تن سے جدا کر دیا تو حضرت زینبؓ کی درد و اندوہ میں ڈوبی ہوئی آواز نے فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیا۔ فرمایا۔

"اگر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تم سے پوچھ لیا کہ تم نے میرے وصال کے بعد آخری امت ہونے کے باوجود میرے اہل بیت سے کیا سلوک کیا، تو کیا جواب دو گے ـــــ تم نے ان میں سے بعض کو قیدی بنا رکھا ہے اور بعض کا خون بہایا ہے۔ کیا میری ہدایت کا تم نے یہ بدلہ دیا ہے کہ میرے بعد میرے اہلِ بیت کے ساتھ بدسلوکیاں کیں؟"

مگر ظالموں نے حضرت امام مظلوم کا سر مبارک تن سے جدا کرنے کے بعد ان کی زخموں سے چور نعش مبارک کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا ـــــ ذرا اندازہ کیجئے اس وقت اپنے محبوب بھائی سے بے پناہ محبت کرنے والی بہن نے کن آنکھوں سے یہ اندوہناک منظر دیکھا ہوگا۔ ابن اثیر کی روایت ہے کہ اس وقت فرطِ غم سے بے تاب ہو کر حضرت زینبؓ نے مدینہ منورہ کی طرف منہ کر کے اپنے نانا سے ان الفاظ میں فریاد کی۔

"یارسول اللہ! دیکھئے، یہ تڑپتی ہوئی، خاک و خون میں لتھڑی ہوئی لاش، آپ کے پیارے حسینؓ کی ہے۔ دشمنوں نے اس کا وہ جسم جو آپ کے دوش مبارک کی زینت بنا کرتا تھا ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ دیکھئے آپؐ کی بیٹیاں طوق و سلاسل میں جکڑی ہوئی ہیں۔ اے سرورِ دو عالمؐ! آج آپؐ کے حسینؓ کی جی بھر کر رسوائی کی گئی ہے۔ اس کے غلام زادوں کو بے رحمی سے شہید کر دیا ہے۔ حسینؓ کی اولاد کو قیدیوں کی طرح ہنکایا جا رہا ہے۔ آپ کے حسینؓ کا سر قلم کر لیا گیا ہے۔ سر سے عمامہ اور جسم سے چادر بھی اتار لی

گئی ہے۔ چاشت کے وقت حسینؓ خیمے میں تھے۔ ساز نہ خیمہ ہے اور نہ کچھ اور۔ طنابیں تک کاٹ دی گئی ہیں۔ آپ کے حسینؓ نے زخم پر زخم کھائے ہیں، وہ نڈھال ہو کر بھوکا پیاسا دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہی وہ حسینؓ ہے جس کا نانا امام الانبیاء اور حبیب کبریا ہے۔"

اسی فریاد کے پس منظر میں سانحہ کربلا کی تفصیلات پڑھیں تو دل خون ہو جاتا ہے۔ دشمنوں نے خیموں کو آگ لگا دی تھی اور سامان بھی لوٹ لیا تھا۔ ایک سفاک نے بیمار زین العابدینؒ کو بھی قتل کرنا چاہا۔ مگر حضرت زینبؓ ان سے لپٹ گئیں اور ان کو شہید ہونے سے بچا لیا۔ اہل بیت کی تمام محترم اور مقدس خواتین کو حراست میں لے لیا گیا تھا اور ان کو قیدیوں کی طرح ہنکایا جا رہا تھا۔ شہادتِ امام حسینؓ کے بعد اس غریب الوطن اور مظلوم قافلے کو گرفتار کر کے کوفے کی طرف چلنے کا حکم دیا گیا۔ زینبؓ بے اختیار اپنے پیارے بھائی کی سر بریدہ لاش سے چمٹ گئیں۔ اور زار و قطار روتے ہوئے فرمایا "اے میرے عزیز بھائی! میں نے تجھے خدا کے سپرد کیا۔ میں غم واندوہ کی وجہ سے جدا نہیں ہو رہی بلکہ تیرے قاتل مجھے تیری لاش سے زبردستی ہٹا رہے ہیں۔"

ابن قتیبہ کی روایت ہے کہ جب عمر بن سعد میدان جنگ سے خواتین اور بچوں کو ساتھ لے کر روانہ ہوا تو عورتوں نے حضرت امام حسینؓ، ان کے لڑکوں اور عزیزوں کی پامال لاشیں دیکھیں تو ضبط نہ کر سکیں اور آہ و فریاد کی دلدوز صدائیں بلند ہو گئیں۔ میں گھوڑا لے کر قریب پہنچا۔ میں نے آج سے پہلے اس قدر حسین عورتیں کبھی نہ دیکھی تھیں۔ مجھے زینبؓ بنت فاطمہؓ کا یہ بین کسی طرح نہیں بھولتا۔

"اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! تجھ پر آسمان کے فرشتوں کا درود و سلام یہ دیکھ حسینؓ ریگستان میں پڑا ہے، خاک و خون سے آلودہ ہے۔ تمام بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ تیری بیٹیاں قیدی ہیں۔ تیری اولاد مقتول ہے۔ ہوا

ان پر خاک ڈال رہی ہے۔"

دو روز بعد مظلومین اہل بیت کا یہ جلوس اس طرح کوفے کی طرف روانہ ہوا کہ قیدی خواتین حرم کے آگے سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کا سر مبارک تھا جسے ظالموں نے نیزے پر چڑھا رکھا تھا۔ جب کوفہ میں داخل ہوئے تو شہر کے تمام لوگ، عورتیں، مرد اور بچے گھروں سے باہر نکل آئے اور اہل بیت کی یہ حالت دیکھ کر زار و قطار رونے لگے۔ اور لوگوں کی آہ و بکا سے فضا معمور ہو گئی تو حضرت زینبؑ نے گرجدار آواز میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"اے کوفے والو۔ بدعہدو! تم وہی ہو جنہوں نے وعدہ خلافی کی اور اب تم بلک بلک کر رو رہے ہو۔ تمہاری مثال اس عورت کی سی ہے جو سوت کاتتی ہے اور جب کات چکتی ہے تو اپنے ہاتھوں سے دھاگے توڑ ڈالتی ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم میں سے ایک شخص بھی ایسا ہے جو جھوٹا وعدہ خلاف اور بڑ ہانکنے والا نہ ہو۔ جس کے دل میں فتور اور نظروں میں کھوٹ نہ ہو۔ جس کی عادت میں فریب نہ ہو جو دشمنوں کی طرح دل میں بغض نہ رکھتا ہو اور جو راہ حق سے منہ موڑ کر لے دینی پر تلا ہوا نہ ہو۔ تم سے تمہارا خدا ناراض ہے اور تم پر اس کا قہر نازل ہو کر رہے گا۔ جھوٹے اور فریب کار کوفیو! تم میرے بھائی کی شہادت پر گر گچھ کے آنسو بہا رہے ہو۔ ہاں خدا کی قسم! خوب آہ و زاری کرو۔ خوب آنسو بہاؤ۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے۔ ہنسو کم اور روؤ زیادہ۔ یہ بدنما داغ جو تمہارے دامن پر لگ چکے ہیں ان آنسوؤں کے پانی سے نہیں دھل سکتے۔ تم نے جس برے کردار کا مظاہرہ کیا ہے، اس نے تمہیں جنت سے محروم کر دیا ہے تمہاری یہ حرکت تمہیں سانپ بن کر ڈستی رہے گی۔ کیا تم ذلت و خواری کی

جس دلدل میں پھنسے ہوئے ہو تمہیں اس کا احساس نہیں۔ قدرت نے اب نیکی کی صلاحیتیں تم سے سلب کر لی ہیں۔ تم بے دست و پا ہو۔ تمہاری صورتیں مسخ ہو چکی ہیں۔ کیونکہ تم نے اللہ کے رسول کی بیٹیوں کی تحقیر و تذلیل کی ہے۔ تمہارا جرم اتنا بڑا ہے کہ اس کی پاداش میں تمہاری صورتیں مسخ ہوں گی اور تم ہمیشہ مصائب و آلام میں مبتلا رہو گے کیا عجب ہے کہ تم پر خون کی بارش ہو۔"

ابن کثیر جو اسی عہد کا ایک بہت بڑا ادیب اور مقرر تھا اس وقت مجمع میں موجود تھا۔ اس نے حضرت زینبؓ کی تقریر سے متأثر ہو کر کہا۔

"میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں! اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے عمر رسیدہ بزرگ، آپ کی عورتیں، آپ کے جوان غرضیکہ آپ کا پورا خاندان دوسروں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ آپ وہ ہیں جن کی گردنیں باطل کے سامنے جھکنے کی عادی نہیں ہیں۔ اور آپ وہ ہیں۔ صدق گوئی اور حق پرستی جن کی فطرت کا ایک حصہ ہے۔"

اس کے بعد اہل بیت کی ستم رسیدہ خواتین کو عبید اللہ بن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس وقت حضرت زینبؓ نے بے حد معمولی لباس پہن رکھا تھا اور وہ پہچانی نہ جاتی تھیں۔ ابن زیاد نے پوچھا "یہ کون بیٹھی ہے"؟ حضرت زینبؓ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ابن زیاد نے تین مرتبہ یہی سوال دہرایا مگر آپ خاموش رہیں۔ تب ان کی کنیز نے جواب دیا "یہ زینبؑ بنت فاطمہؑ ہیں"۔ ابن زیاد نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اس خدا کی ستائش جس نے تم لوگوں کو رسوا اور ہلاک کیا ہے اور تمہارے نام کو بٹہ لگایا"۔ یہ سنتے ہی حضرت زینبؓ نے گرج کر جواب دیا۔

"ہزار ستائش اس خدا کے لئے جس نے ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عزت

بخشی اور ہمیں پاک کیا۔ نہ کہ جیسا تو کہتا ہے۔ فاسق رسوا ہوتے ہیں اور فاجروں کے نام کو بٹہ لگتا ہے۔"

ابن زیاد نے پھر کہا: "تو نے دیکھا کہ خدا نے تیرے خاندان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔"

حضرت زینبؓ: "ان کی قسمت میں شہادت لکھی تھی اس لیئے وہ مقتل میں پہنچ گئے۔ عنقریب خدا انہیں اور تجھے ایک جگہ جمع کر دے گا اور تم باہم اس کے حضور سوال و جواب کرو گے۔"

ابن زیاد یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا تو عمرو بن حریث نے کہا: "خدا امیر کو سنوارے۔ یہ تو محض ایک عورت ہے عورتوں کی بات کا خیال نہیں کرنا چاہیئے۔" ابن زیاد نے پھر جھنجھلا کر کہا: "خدا نے تیرے سرکش سردار اور تیرے اہل بیت کے نافرمان باغیوں کی طرف سے میرا دل ٹھنڈا کر دیا۔" اس پر حضرت زینبؓ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا: "خدا کی قسم تو نے میرے سردار کو قتل کر ڈالا۔ میرا خاندان مٹا دیا۔ میری شاخیں کاٹ دیں۔ میری جڑ اکھاڑ دی۔ اگر اس سے تیرا دل ٹھنڈا ہو سکتا ہے تو ہو جائے۔"

ابن زیاد نے مسکرا کر کہا: "یہ شجاعت ہے۔ تیرا باپ بھی شاعر اور شجاع تھا۔"

حضرت زینبؓ نے جواب دیا: "عورت کو شجاعت سے کیا سروکار۔ میری مصیبت نے مجھے شجاعت سے غافل کر دیا ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں یہ تو دل کی آگ ہے۔"

اس کے بعد ملعون ابن زیاد نے حضرت زین العابدینؓ کے ایک جواب سے برافروختہ ہو کر انہیں قتل کرنے کا حکم جاری کر دیا تو حضرت زینبؓ بے قرار ہو کر چیخ اٹھیں اور کہا: "میں تجھے خدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ اگر تو اس لڑکے کو ضرور ہی قتل کرنا چاہتا ہے تو مجھے بھی اس کے ساتھ مار ڈال۔" ابن زیاد دیر تک حیرت کے ساتھ حضرت زینبؓ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ رشتہ بھی کیا عجب چیز ہے۔ اللہ کی قسم مجھے یقین ہے کہ یہ سچے دل سے اس لڑکے کے ساتھ قتل ہونا چاہتی ہے۔

اچھا اس لڑکے کو رہا کردو اور اسے بھی دوسری عورتوں کے ساتھ جب انہیں بھیجو تو بھیج دو (ابن جریر کامل)

ابن زیاد نے اس بے سروسامان قافلے کو سیدنا حضرت امام شہید کے سر مبارک کے ساتھ یزید کے پاس روانہ کر دیا۔ الانوار میں لکھا ہے کہ جب یہ قافلہ دمشق پہنچا تو حضرت زینب درد ناک اشعار پڑھ رہی تھیں۔ ان کا مطلب یہ تھا

"اے اہل بیت! کیا تمہیں اس حادثے نے غم زدہ نہیں کیا۔ کہ امام حسینؓ بھوکے پیاسے شہید ہوئے جب کہ ان کے علاوہ ہر شخص سیراب تھا!

حسینؓ نے لوگوں سے ہر چند کہا کہ میرے باپ علی المرتضےٰ ہیں جو متقی اور پرہیزگار تھے۔ میری ماں سیدہ فاطمۃ الزہراؓ ہیں۔ جو زہد و اتقا میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ لیکن لوگوں نے کہا تو یہی کہا کہ تمہارے لیے آب تیغ تو ہے آب فرات نہیں۔"

جب یہ لوگ یزید کے دربار میں پیش کئے گئے تو حضرت فاطمہؓ بنت علیؓ کی روایت کے مطابق ایک سرخ رنگ کا شامی کھڑا ہوا اور یزید سے کہنے لگا۔ اے امیر! یہ لڑکی مجھے عنایت کر دیجئے اور میری طرف اشارہ کیا۔ اس وقت میں کم عمر اور خوب صورت تھی یہ سن کر خوف سے کانپنے لگی اور اپنی بہن زینبؓ کی چادر مضبوطی سے پکڑ لی۔ حضرت زینبؓ نے پکار کر کہا "تو کمینہ ہے۔ نہ تجھے اس کا اختیار ہے اور نہ یزید کو اس کا حق ہے" یزید کو یہ سن کر سخت غصہ آیا۔ اور اس نے غضب ناک آواز میں کہا "تو جھوٹ بکتی ہے خدا کی قسم مجھے یہ حق حاصل ہے اگر چاہوں تو ابھی کر سکتا ہوں" حضرت زینبؓ نے اسی طرح سخت لہجے میں جواب دیا۔ "ہرگز نہیں۔ خدا نے تمہیں یہ حق نہیں دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ تم ہماری ملت سے نکل جاؤ اور ہمارا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کر لو" یہ سخت جواب سن کر یزید اور بھی برہم ہوا اور کہنے لگا کہ دین سے تیرا باپ اور تیرا بھائی

نکل چکے ہیں۔ حضرت زینبؑ نے فرمایا کہ اللہ کے دین سے، میرے باپ کے دین سے، میرے بھائی کے دین سے، میرے نانا کے دین سے تو نے، تیرے باپ نے ہدایت پائی ہے۔ یزید نے چلا کر کہا: "اے دشمنِ خدا تو جھوٹی ہے"۔ اس موقع پر حضرت زینبؑ نے ظالم و جابر یزید کے سامنے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس خطبے کے ہر ایک لفظ سے جرأت و بسالت حق گوئی و بے باکی، خود اعتمادی اور اسلام کی محبت ٹپکتی ہے۔ وہ ایک بے بس و مجبور اور بے دست و پا قیدی کی حیثیت سے یزید کے سامنے کھڑی تھیں۔ مگر ان کی تقریر میں بادل کی کڑک، بجلی کی چمک اور طوفان کا ساز و ز تھا۔ دیکھئے ایک جابر ترین حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی روایات کو حضرت امام شہیدؑ کی بہن نے کس طرح زندہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان عورت بدترین حالات اور خوفناک ترین مصائب میں بھی ظلم و تشدد اور جبر و عدوان سے مرعوب ہونا نہیں جانتی۔ آپ نے فرمایا۔

"اے یزید! اگر تو نے اللہ کی زمین کو اس کی وسعتوں کے باوجود ہم لوگوں پر تنگ کر دیا ہے۔ اور ہم تیرے قبضے میں آ گئے ہیں ہمیں زنجیروں میں جکڑ کر کشاں کشاں تیرے پاس لایا گیا ہے۔ تو کیا تو نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اللہ نے ہمیں ذلت میں مبتلا کر دیا ہے اور تجھے عزت عطا کی ہے۔ تیرے سر پر غرور اور تکبر کا نشہ سوار ہے۔ تجھے اس بات پر فخر ہے کہ تیرے ارد گرد ہاں میں ہاں ملانے والے لوگ جمع ہیں۔ تجھے اس بات پر ناز ہے کہ تو اپنی خواہش کے مطابق حکومت کر رہا ہے اس وقت جب کہ پورے ملک پر تیرا قبضہ ہو چکا ہے۔ اور تیرے لئے راستہ ہموار ہو چکا ہے۔ شاید تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ حکومت ہمیشہ کے لئے تیرے حصے میں آ گئی ہے۔ چند دن انتظار کر۔ ابھی سے اتنا

مغرور نہ بن۔ کیا تو اللہ کا یہ فرمان بھول گیا ہے کہ منکرین یہ نہ سمجھیں کہ ہم جو انہیں مہلت دیتے ہیں اس میں ان کے لئے بہتری ہے مہلت تو ہم اس لئے دیتے ہیں تاکہ وہ اور زیادہ گنہگار ہو جائیں۔ آخر کار ان کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ اے یزید! کیا یہ انصاف ہے کہ تیری عورتیں تو پردے میں رہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹیاں بے حجاب پھرائی جائیں۔ انہیں قیدی بنایا جائے دشمن انہیں شہر بہ شہر لئے پھریں۔ تیرے سر پھرے سپاہی نہایت گستاخی کے ساتھ انہیں گھور گھور کر دیکھیں۔ ان کے ساتھ نہ تو مردوں میں کوئی سرپرست ہے۔ اور نہ کوئی حمایت کرنے والا۔

اے یزید! تیرا یہ فعل خدا سے بغاوت نہیں ہے تو کیا ہے۔ اگر اسے خدا کے رسولؐ سے انکار نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ بھلا اس شخص سے کیا امید کی جا سکتی ہے جس کی تیغ زبان نے شہداء کے قلوب مجروح کئے۔ جس نے پاکیزہ اور برگزیدہ ہستیوں کے جگر چبائے عرب میں جو خدا کی منکر جماعت ہے تم اس سے بھی زیادہ سخت خدا اور اس کے رسولؐ کے منکر ہو۔ خدا کے رسولؐ سے تم کو بیر ہے۔

اے یزید! تو نے اولادِ نبیؐ کو بے دردی سے ذبح کر کے پرانی عداوت کا بدلہ لیا ہے۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ تیری خواہش یہ ہوگی کہ دنیا میں نہ تیرے ہاتھ ہوتے اور نہ زبان تاکہ جو کچھ تو کرتا اور کہتا رہا ہے نہ ہوتا۔ یزید! عنقریب تو اور شہداء ایک جگہ جمع ہوں گے۔ تیری ماں اس وقت یہ خواہش کرے گی کہ کاش! تو اس کے پیٹ سے پیدا نہ ہوتا۔ اور تیرے باپ کی خواہش یہ ہوگی کہ کاش! تو اس کا بیٹا نہ ہوتا۔ اس دن

ہم تجھے اللہ کے قہر و غضب کا نشانہ بنتے ہوئے پائیں گے۔ ہم کہیں گے کہ اے خدا! اس پر اپنا قہر نازل کر۔ رسولِ خدا بھی سخت افسردہ ہوں گے اے یزید! یہ وقت کا انقلاب ہے کہ آج مجھے تیرے سامنے لب کشائی پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ ورنہ یقین جان کہ میں تجھ سے سخت نفرت کرتی ہوں اور میں تجھے ذلیل سمجھتی ہوں۔ تیری سخت گیری اور دشمنی کا میرے دل پر بڑا اثر ہے۔ میرے دل سے ہوک اور میرے سینے سے آہیں نکلتی ہیں۔ اگر تو نے یہ سمجھا ہے کہ ہم بکریوں کا ریوڑ ہیں تو عنقریب تجھ پر یہ بات روشن ہو جائے گی کہ ہم قہر و غضب کے عالم میں بپھرے ہوئے شیروں سے بھی زیادہ غضب ناک ہیں اور اس بات کا علم تجھے اس وقت ہو گا جب تیرے اردگرد نوکروں، چاکروں، غلاموں اور کنیزوں کا ہجوم نہ ہو گا۔ یزید! تو اپنی دھن میں مست رہ کر جو جی میں آئے کرتا جا مگر قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمارے خاندان کو وحی و الہام کے شرف سے نوازا، ہم کو زیادہ دیر تک اس حال میں نہیں رکھے گا۔ دنیا سے ہمارے نقوش نہیں مٹیں گے تو نے ہم پر جو مظالم کئے ہیں تجھے ان کا بدلہ ضرور ملے گا۔ تو مکر و فریب کی ایک پوٹ ہے اور تیرا یہ اقتدار چند روزہ ہے۔ تیری حکومت تباہ و برباد ہونے والی چیز ہے۔"

حضرت زینبؓ کی یہ پیش گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی تین سال سات ماہ بعد یزید درد قولنج میں مبتلا ہوا اور تڑپ تڑپ کر ۶۴ھ میں مر گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیٹے معاویہ کو وصیت کے لئے بلایا مگر وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ مجھے ایسی سلطنت نہیں چاہیئے جس کی بنیاد اولادِ رسولؐ کے خون پر رکھی گئی ہو۔ ۶۶ھ میں ایک شخص مختار بن عبید ثقفی عذابِ الٰہی بن کر ظاہر ہوا اور اس نے اقتدار حاصل کرتے

ہی تمام قاتلانِ حسینؓ کو سخت اذیتیں دے کر قتل کیا۔

حضرت فاطمہ بنت علیؓ کی روایت ہے کہ جب یزید نے حضرت زینب کو کہا کہ اے دشمن خدا تو جھوٹی ہے تو حضرت زینبؓ نے فرمایا کہ تو زبردستی حاکم بن بیٹھا ہے ظلم سے گالیاں دیتا ہے۔ اپنی طاقت سے مخلوق کو دباتا ہے۔ حضرت فاطمہ کہتی ہیں کہ یہ سن کر یزید شاید شرمندہ ہو گیا کیونکہ پھر وہ خاموش رہا۔ مگر وہ شامی جس نے حضرت فاطمہ بنت علیؓ کا مطالبہ کیا تھا پھر کھڑا ہوا اور وہی بات دہرائی۔ اس پر یزید نے اسے غضبناک آواز میں ڈانٹ کر کہا "دور ہو کمبخت خدا تجھے موت کا تحفہ بخشے"۔

اس کے بعد یزید نے انہیں عزت و احترام کے ساتھ رکھا اور چند روز بعد نہایت اچھے طریقے سے اپنے ایک معتبر آدمی کے ساتھ مدینہ روانہ کر دیا۔ راستے میں حضرت زینبؓ نے بھائی کی قبر دیکھی تو دل بھر آیا اور فرمایا "اے میرے شفیق بھائی! اے میری ماں کے نورِ عین! کس منہ اور کس زبان سے وہ مصائب اور سختیاں بیان کروں جو آپ کی جدائی کے بعد ہم پر ہوئیں۔ اس قوم نے ہمیں رسوا کیا ہماری تشہیر کی۔ ہمیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ ہم سے سخت کلامی کی گئی۔ میں کن کن سختیوں کا حال بیان کروں"۔

مدینہ کے قریب پہنچ کر حضرت زینبؓ اور حضرت فاطمہؓ نے اپنی چوڑیاں اور کنگن اتار کر اس شخص کو بھیجے جو ان کے ساتھ آیا تھا۔ اور راستے میں اچھا سلوک کرتا رہا تھا۔ حضرت زینبؓ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہلا بھیجا کہ یہ تمہاری نیکی کا بدلہ ہے۔ اس وقت ہمارے پاس کچھ نہیں ہے جو تمہیں دیں مگر اس شخص نے یہ زیورات واپس کر دیئے۔ اللہ اکبر! اس حالت میں بھی فیاضی اور مروت کا یہ عالم تھا کہ اس شخص کا خالی ہاتھ جانا گوارا نہ ہوا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جب یہ قافلہ خستہ خراب

حالت میں گنبدِ خضرا کے سامنے پہنچا تو حضرت زینبؑ نے روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لپٹ کر فریاد کی۔

"اے اللہ کے رسول! میں یہ خبر بد لے کر آئی ہوں کہ آپؐ کی اولاد کربلا میں بے دردی کے ساتھ بھوکی پیاسی شہید کر دی گئی ہے۔ آپؐ کی بیٹیاں رسوائی اور بے سروسامانی کے عالم میں قید وبند کی مصیبتیں جھیل کر آئی ہیں۔"

اس کے بعد مدینہ میں ہر وقت عورتوں کی بھیڑ آپ کے گرد جمع رہتی، اور عام اہلِ مدینہ کا اجتماع رہتا تھا۔ یزید کے خلاف حجاز میں سخت نفرت پھیل چکی تھی۔ اور لوگ بے حد مشتعل ہو رہے تھے۔ والیٔ مدینہ نے یزید کو حالات سے باخبر کیا تو اس نے حکم دیا کہ حضرت زینبؑ سے کہا جائے کہ کسی دوسری جگہ جو انہیں پسند ہو تشریف لے جائیں۔ پہلے تو حضرت زینبؑ نے انکار کر دیا مگر پھر لوگوں کے سمجھانے پر مصر جانے کے لئے رضامندی ظاہر کی اور والیٔ مصر کے محل دار الحمراء میں قیام فرمایا۔ بعض کہتے ہیں کہ ۶۲ھ میں طاعون یا قحط پھیلنے کی وجہ سے شام چلی گئی تھیں۔ اس کے بعد اہلِ مدینہ نے یزید کے خلاف بغاوت کر دی جو حادثۂ حرّہ کے نام سے مشہور ہے یزیدی افواج نے مدینہ پہنچ کر گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور تین دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ اس واقعہ کے بعد یزید نے حضرت زینبؑ کو کافی وظیفہ دینے کی پیشکش کی، مگر آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت زینبؑ نے ۶۲ھ میں شام میں وفات پائی اور ان کا مزار دمشق کے ایک قصبے زینبیہ میں ہے۔

حضرت زینبؑ بنت زہراؑ کی پاک زندگی جن حیرت انگیز اوصاف کا مجموعہ ہے ان کی ایک معمولی سی جھلک آپ نے گذشتہ صفحات میں دیکھ لی ہے۔ یہ ان کے

سیرت و کردار کی وہ روشنی ہے جو ماضی کے کئی دبیز پردوں سے چھن چھن کر آ رہی ہے اگرچہ ماضی کے گہرے دھندلکوں نے اس کی حقیقی تابانی ہم تک نہیں پہنچنے دی۔ اس کے باوجود حضرت زینبؑ کی سیرت کا نور آج بھی ہمارے قلب و ذہن کو منور کر رہا ہے ہمارے ہاں ان لوگوں کی کمی نہیں جو رسمی باتوں پر مر مٹنے کے لیئے تیار ہو جاتے ہیں اور روایات پر جانیں نچھاور کرنے کے لیئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں۔ ان پاک ہستیوں کی محبت اور عقیدت کے نشے میں سرشار رہنے والے بھی بہت ہیں جو اپنی بیٹیوں کو حضرت زینبؑ کے پاک نام سے منسوب کر کے سمجھتے ہیں کہ عقیدت کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے بے پناہ مصائب پر آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے رواں رکھ کر ثواب حاصل کرنے والے بھی کم نہیں ہیں۔ آیئے ایک لمحہ کے لیئے ایمانداری سے غور کریں کہ ہماری ملت نے کتنی ایسی خواتین کو جنم دیا ہے جن کے تصور و تخیل نے بھی حضرت زینبؑ کی رفعتوں اور اخلاقی بلندیوں کو چھونے کی کوشش کی ہے؟ صرف زینب نام رکھ لینے اور ان کو پیش آنے والے دردناک مصائب کو قصے کہانیوں کی طرح بیان کر دینے سے ہم انہیں خراج عقیدت ادا نہیں کر سکتے۔ حضرت زینبؑ کی پوری زندگی اس حقیقت کی ترجمان ہے کہ مسلمان عورت تقویٰ و طہارت کا پیکر ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی آزمائش اور بدترین مصیبت بھی انہیں جادۂ حق سے نہیں ہٹا سکتی اور نہ اسے یادِ الٰہی سے غافل کر سکتی ہے۔ وہ حق و صداقت کی حفاظت کے لیئے اپنے خون سے سینچے ہوئے گلستانِ حیات کو خاکستر ہوتا دیکھ سکتی ہے مگر باطل کے سامنے نہیں جھک سکتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورت کمزور ہوتی ہے اور فوراً مرعوب ہو جاتی ہے۔ مگر حضرت زینبؑ کی حیاتِ طیبہ ہمیں بتاتی ہے کہ عورت کمزور ہو سکتی ہے مگر مسلمان عورت عزم و ارادے کی آہنی چٹان ہوتی ہے۔ طوفان اس سے ٹکرا کر رخ بدل سکتے ہیں۔ مگر اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے۔ حضرت زینبؑ کو سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام سے جو

بے پناہ محبت تھی کیا اس کے پیش نظر وہ بھائی کو یزید کے سامنے سرِ اطاعت خم کرنے کا مشورہ نہ دے سکتی تھیں؟ جب انہیں موت سامنے دکھائی دے رہی تھی وہ اپنے بچوں کو لے کر بھائی سے علیحدہ ہوتے پر قادر نہ تھیں جبکہ عام عورتیں معمولی اغراض کے لئے بھائیوں سے ہمیشہ کے لئے تعلقات منقطع کر لیتی ہیں۔ وہ کہہ سکتی تھیں کہ بھائی آپ میرا مشورہ تسلیم نہیں کرتے اور جان بوجھ کر موت کے گڑھے کی طرف جا رہے ہیں میں اپنے بیٹوں کو موت کا لقمہ کیوں بننے دوں؟ کون نہیں جانتا کہ ماں کی ممتا اکثر و بیشتر بھائی کی محبت پر غالب آجاتی ہے۔ ایک عورت اپنے حقیقی بھائی کو چھوڑ سکتی ہے مگر اپنی اولاد کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہلاک ہوتے دیکھنا تو کیا کچھ عرصے کے لئے چھوڑنا بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ ان معاملات کو ہماری عورتیں خوب سمجھتی ہیں کہ وہ کس طرح اپنے بھائیوں کی بیویوں اور بچوں تک سے حاسدانہ رویہ اختیار کر کے یہ خون کا رشتہ بھی توڑ سکتی ہیں۔ مگر حضرت زینبؑ نے جس فقید المثال کردار کا مظاہرہ کیا ہے وہ ایک مسلمان عورت کے لئے نسوانی روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہیں اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت کی بدولت حالات کی نزاکت کا پورا احساس تھا مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنی صاحب شرف و فضیلت ماں کی وصیت پر لخت ہائے قلب و جگر کے پھول نچھاور کئے۔ میدانِ کربلا میں اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیز و اقارب کو خاک و خون میں لوٹتے دیکھا ننھے ننھے معصوم بچوں کے دلوں میں زہریلے تیر پیوست ہوتے دیکھے پورے خاندان کو ریگ زارِ کربلا میں شدتِ پیاس سے تڑپتے دیکھا۔ اپنے دو نو عمر بیٹوں کی المناک شہادت کا دل ہلا دینے والا نظارہ دیکھا۔ بھوک اور پیاس کی ناقابلِ بیان سختیاں سہیں۔ مگر کبھی شکوہ و شکایت کا ایک حرف بھی ان کے منہ سے نکلا؟ کبھی انہوں نے بھائی سے کہا کہ ہم سب کو کس مصیبت میں مبتلا کر دیا آپؑ نے ــــ جائیے یزید کی بیعت کو لیجیے۔ ایک عورت کے لئے اس سے زیادہ ڈگمگا دینے والا مرحلہ اور کونسا

ہوسکتا ہے کہ اس کے سامنے پورے خاندان کی لاشیں پڑی ہیں اور ایک آخری سہارا بھی بہت جلد چھن جانے والا ہے، پورا خاندان فرات خون میں ڈوب چکا ہے اور اب ظلم و ستم کی آگ کے شعلے اس کے بے یار و مددگار بھائی کی طرف لپک رہے ہیں، زندگی کی تمام امیدیں منقطع ہو چکی ہیں، اور اس ویران و سنسان صحرا کے اندھیرے میں صرف خون آشام تلواروں کی چمک نظر آرہی ہے پھر یہ بھی معلوم ہے کہ چشم زدن میں ان تمام مصائب و آلام کا نہ صرف خاتمہ ہوسکتا ہے بلکہ دنیا کا بڑے سے بڑا اعزاز ان کے قدموں میں سجدہ ریز ہوسکتا ہے۔ صرف یزید کی اطاعت قبول کر لینے سے عیش و عشرت کے خزانے ان کے راستوں میں بچھ سکتے ہیں۔ اور یزید ہر شہید کے ایک ایک قطرۂ خون کے بدلے لاکھوں دینار بطور خون بہا دے سکتا ہے۔ ایسے پُر آشوب اور پُر آزمائش ماحول میں صرف ایک سچی مسلمان عورت ہی ثابت قدم رہ سکتی ہے کیا دنیا کی کوئی مریم صفات بہن بھی اس صبر و استقلال، عزم و ثبات اور ایثار و قربانی کی ادنیٰ سی مثال پیش کرسکتی ہے؟ کیا تاریخ حضرت زینبؑ کے مقابلے میں ایک بھی ایسی عورت پیش کرسکتی ہے جس نے بہن کا اتنا بلند اور ارفع کردار ادا کیا ہو۔ پوری تاریخ پڑھ جایئے۔ بدترین دشمن بھی شہادت دیں گے کہ حضرت زینبؑ نے اپنے بھائی کو جادۂ حق سے سرِمو انحراف کرنے کا اشارہ تک نہیں کیا بلکہ اپنے جان سے عزیز بھائی کو تن تنہا لڑتے اور زخموں سے چھلنی ہو کر شہید ہوتے دیکھا۔ سب کے ساتھ ان کا بھی سر قلم ہوتے دیکھا۔ ان کے جسدِ اطہر کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ہوتے دیکھا، خیموں کو جلتے اور لٹتے ہوئے دیکھا مگر کہا تو یہی کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تجھ پر درود و سلام، اپنے نواسے کی حالت دیکھ لیجئے۔ ابن زیاد ایسے جابر و ظالم کے غرور و نخوت کو اپنے حیا پرور قدموں سے کچل کر رکھ دیا اور یزید کے بھرے دربار میں اس تباہ حال اور بے یار و مددگار خاتون معظمہ نے بڑی جرأت و بسالت کے ساتھ کلمۂ حق بلند کیا۔ اسے برملا وہ سب کچھ کہا جسے ایک خود مختار اور ظالم حکمران

ایک لمحہ کے لیئے برداشت نہیں کر سکتا۔ کیا یہ صرف بھائی کی محبت تھی بھائی کی محبت کا جذبہ فطری حد تک درست مگر جس قوت اور طاقت نے حضرت زینبؑ کے سامنے اوجِ ثریا کو سرنگوں کر دیا وہ ان کی روحانی طاقت تھی۔ وہ خوب سمجھتی تھیں کہ ان کا بھائی کسی دنیاوی غرض کے لیئے سینہ سپر نہیں ہے بلکہ وہ اللہ کے دین کی حفاظت و بقا کے لیئے موت سے ٹکرا رہا ہے۔ ان کی تمام قربانیاں اسلام کے لیئے تھیں۔ وہ اپنے نانا کے دین کی لاج رکھنے کے لیئے بھائی کا ساتھ دے رہی تھیں۔ انہیں دنیا سے کیا غرض۔ جاہ پرستی اور دنیا کی محبت کیسے ان کے قدموں کو متزلزل کر سکتی تھی؟ ورنہ دنیا تو اپنے حسن وجمال اور آسائشوں کے ساتھ آغوش وا کئے سامنے کھڑی تھی صرف چند قدم آگے بڑھ کر سر جھکانے کی دیر تھی۔ مگر وہ سر کٹا گئے۔ اللہ کی چوکھٹ کے سوا کسی کے دربار میں جھکے نہیں۔ ورنہ آج مسلمان کسی سے آنکھ ملا کر بات کرنے کے قابل نہ ہوتے اور اسلام کی آبرو لُٹ جاتی اور میدانِ کربلا حسین علیہ السلام کا نہیں ناموسِ اسلام کا مدفن بنتا۔

کیا حضرت زینبؑ سے عقیدت رکھنے والی نہیں یہ سوچنا گوارا کریں گی کہ مصیبت زدہ زینبؓ کی انگشتِ شہادت انہیں کس منزل کا راستہ دکھا رہی ہے۔

(روشن آراء)

[illegible]

حضرت شہربانوؑ

(زوجہ حضرت امام حسین علیہ السلام)

شہنشاہِ ایران یزدگرد کی سطوت و شوکت کے آغوش میں پل کر جوان ہونے والی، سلیم الفطرت خاتون، جس کا اشارۂ ابرو قانون کی حیثیت رکھتا تھا جس کے پاؤں صرف زربفت و کمخواب کے فرش سے آشنا تھے۔ جو کھلونوں کی جگہ ہیروں اور جواہرات سے کھیلتی رہی جس کی خدمت کے لئے ہزاروں غلام اور ان گنت کنیزیں موجود تھیں جس کے کان عیش و عشرت کے رسیلے نغموں سے واقف تھے۔ جس کی آنکھوں نے ہمیشہ شاہانہ عظمت و جلالت کے مناظر دیکھے تھے جس کے منہ سے نکلا ہوا ہر جملہ فرمانِ شاہی تھا۔ وہ اس عظیم الشان سلطنت کی شہزادی تھی جسے کئی ممالک خراج دیتے تھے۔ وہ اس باپ کی بیٹی تھی جسے کسریٰ کا لقب حاصل تھا اور دنیا اس کا نام سن کر کانپ اٹھتی تھی ——

امام حسین علیہ السلام کے خانہ فقر میں آئی تو ایک سادہ منش اور درویش عورت تھی۔ شاہی نے فقر و غنا کی خلعت پہن کر تاریخ میں ایک نئی روایت قائم کی جسے شہربانو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت شہربانو

ایران کے آخری شہنشاہ یزدگرد کی بیٹی تھیں جو کسریٰ کے لقب سے مشہور تھا ایک روایت کے مطابق آپ ایران کے مشہور اور زندہ جاوید انصاف دوست بادشاہ نوشیرواں عادل کی اولاد سے تھیں۔ آپ کی ابتدائی زندگی سے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ ایران میں پیدا ہوئیں اور کسریٰ کے عظیم الشان محلات میں پرورش پائی۔ دنیا کی کوئی نعمت ایسی نہ تھی جو انہیں بچپن سے حاصل نہ رہی ہو۔ اس زمانے میں کسریٰ کی سلطنت دنیا کی بے حد طاقتور اور بہت بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی سینکڑوں چھوٹے بڑے صوبے کسریٰ کے زیر حکومت تھے اور کئی بادشاہ اسے خراج ادا کرتے تھے۔ وسیع و عریض سلطنت کے علاوہ وہ بے شمار خزانوں کا مالک تھا۔ اور اس کے پاس فنون حرب سے واقف جدید ترین ہتھیاروں سے لیس بہت بڑی فوج موجود تھی بڑے رعب اور دبدبے کے ساتھ حکومت کرتا تھا۔ اس کی بیٹی شاہران نے اسی شہنشاہ کی شوکت خسروانہ کے سائے میں پرورش پائی۔ ظاہر ہے کہ جس کا باپ اتنی رفیع الشان اور عظیم سلطنت کا حکمران ہو اس کے ناز و نعم کے لئے کیا کچھ فراہم نہ کیا گیا ہوگا۔ زربفت و دیبا کے فرش پر چلنا اس کے پاؤں کے لئے مقدر ہو چکا تھا۔ جدھر نگاہ اٹھتی تھی جاہ و حشم کے لاتعداد مناظر دکھائی دیتے۔ خدام پرے جمائے سر جھکائے ہر دم اشارے کے منتظر رہتے۔ خواہش کا اظہار کئے بغیر دنیا کی ہر نعمت حاضر ہو جاتی زیورات اور گراں قیمت ملبوسات کا کون اندازہ کر سکتا تھا۔ اس کے قدموں میں ہر

وقت زر و جواہر بچھے رہتے تھے۔ بچپن سے جوانی تک آنکھوں نے صرف حسن وطرب کے مناظر سے ٹھنڈک حاصل کرنا سیکھا تھا۔ کانوں نے صرف خوشی اور مسرت کے نغمات سنے تھے۔ غم واندوہ اور فکر و تردد وہ الفاظ تھے جو ایوانِ کسریٰ کی چاردیواری کے اندر بالکل بے معنی تھے۔ شاہزادی شاہبران نے اس ماحول میں پرورش پائی جہاں ہر قدم پر سینکڑوں نگاہیں تصدق ہوتی تھیں۔ جہاں اس کے ہونٹ ذراسی جنبش کرتے تو ہزاروں کان کھڑے ہو جاتے۔ معمولی سا اشارہ ہوتا تو پلک جھپکنے میں تعمیل ہوتی۔ اس کی ایک نگاہِ غلط انداز گداؤں کو تونگر کردیتی۔

ان کے مشرف بہ اسلام ہونے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے حبالۂ عقد میں آنے سے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ جب ماہ صفر ۱۶ھ میں مسلمانوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص کی زیر قیادت ایران کے آخری شہنشاہ یزدگرد کو شکست دے کر اس کے پایۂ تخت مدائن پر قبضہ کر لیا تو مسلمانوں کو وہاں سے بے شمار خزانے، ہیرے جواہرات اور حیرت انگیز قسم کی نادر اور گراں قیمت اشیاء ملیں جن میں کسریٰ کا زرنگار تاج شاہی، قیمتی ملبوسات اور دوسری بے شمار چیزوں کے علاوہ ایک بیحد قیمتی فرش بھی تھا جس پر بادشاہ بیٹھ کر شراب پیا کرتا تھا۔ اسی موقع پر اسلامی لشکر نے کسریٰ کی بیٹی شاہبران کو بھی گرفتار کر لیا۔ جو لاتعداد ہیرے اور جواہرات وغیرہ سمیٹ کر فرار ہونے کی فکر میں تھی۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو اتنی دولت ملی کہ ہر سوار کے حصے میں بارہ ہزار دینار آئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے مالِ غنیمت کا خمس شاہزادی شاہبران کے ساتھ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے تمام مالِ غنیمت صحابہ میں حسبِ مراتب تقسیم کر دیا اور کسریٰ کے ملبوساتِ شاہانہ اور تاج شاہی ایک بدو محلم بن زداحہ کو پہنائے تاکہ لوگ کسریٰ ایسے صاحبِ جلالت و شوکت شہنشاہ کی تباہی اور زوال سے

عبرت حاصل کریں۔ اس کے علاوہ مسلمان اللہ کا شکر ادا کریں۔ کہ اسلام کی بدولت انہیں اللہ نے کتنی عظمت عطا فرمائی ہے کہ ایک معمولی بدو دنیا کے بہت بڑے شہنشاہ کے لباس میں ملبوس سب کے سامنے کھڑا ہے۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کے بعد شہزادی شہربان بنت کسریٰ دربارِ خلافت میں پیش کی گئی جس کے ملبوسات قیمتی زر و جواہر سے جگمگا رہے تھے۔ آپ نے اس کے زر و جواہر اتارنے کا حکم دیا لیکن شہربان نے سخت مزاحمت کی اور زیورات وغیرہ اتارنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ طیش میں آ گئے تو حضرت علیؓ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اگر کسی قوم کا رئیس ذلیل ہو جائے یا کوئی مالدار فقیر ہو جائے تو تم اس پر رحم کرو۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ کا غصہ فرو ہو گیا۔ آپ نے دیکھا کہ شہزادی شہربان حضرت امام حسینؓ کی طرف پر اشتیاق نگاہوں سے دیکھ رہی تھی چنانچہ آپ نے حکم دیا کہ شہزادی شہربان حضرت امام حسین کے حوالے کر دی جائے

حضرت امام حسینؓ نے انہیں آزاد کر دیا اور وہ برضا و رغبت مسلمان ہو کر حضرت امام حسینؓ کے نکاح میں آئیں۔ اور آپ کا اسلامی نام شہربانو رکھا گیا۔

علامہ شبلی نعمانی نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "عام طور پر مشہور ہے کہ جب فارس فتح ہوا تو یزدگرد شہنشاہ فارس کی بیٹیاں گرفتار ہو کر مدینہ آئیں۔ حضرت عمرؓ نے انہیں عام لونڈیوں کی طرح بازار میں بیچنے کا حکم دیا لیکن حضرت علیؓ نے منع کیا کہ خاندانِ شاہی کے ساتھ ایسا سلوک جائز نہیں۔ ان لڑکیوں کی قیمت کا اندازہ کرا لیا جائے پھر یہ لڑکیاں کسی کے اہتمام اور سپردگی میں دی جائیں اور اس سے ان کی قیمت اعلیٰ سے اعلیٰ شرح پر لی جائے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے خود ان کو اپنے اہتمام میں لے لیا۔ اور ایک حضرت امام حسینؓ کو ایک محمد بن ابی بکرؓ کو اور ایک عبداللہ بن عمرؓ کو دے دی۔ زمخشری نے جس کو فنِ تاریخ سے کچھ واسطہ نہیں "ربیع الابرار" میں اس کو

لکھا اور ابن خلکان نے حضرت امام زین العابدینؒ کے حال میں یہ روایت درج کردی لیکن یہ محض غلط ہے۔ زمخشری کے علاوہ کسی نے اس کو نہیں لکھا۔ تاریخی قرائن اس کے خلاف ہیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں یزدگرد اور خاندانِ شاہی پر مسلمانوں کو مطلق قابو حاصل نہیں ہوا۔ مدائن کے معرکے میں یزدگرد مع تمام اہل و عیال کے دار السلطنت سے نکلا اور حلوان پہنچا۔ جب مسلمان حلوان کی طرف بڑھے تو وہ اصفہان بھاگ گیا اور پھر کرمان وغیرہ میں ٹکراتا پھرا۔ مرو پہنچ کر ۳۱ھ میں جو حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ ہے مارا گیا۔ اس کی آل اولاد اگر گرفتار ہوئے ہوں گے تو اسی وقت ہوئے ہوں گے علاوہ ازیں جس وقت کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس وقت حضرت امام حسینؓ کی عمر بارہ برس تھی کیونکہ آپ ہجرت سے پانچ سال بعد پیدا ہوئے (ایک روایت کے مطابق آپ کی تاریخ پیدائش ۵ شعبان ۴ھ ہے) اور فارس ۲۱ھ میں فتح ہوا۔"

اگر علامہ شبلی نعمانی کے ان دلائل کو پیش نظر رکھا جاتا تو حضرت شہربانوؓ کا یہ واقعہ محض من گھڑت افسانہ معلوم ہوتا ہے مگر دوسری طرف اس سلسلے میں تاریخی شواہد موجود ہیں کہ یزدگرد کی بیٹی شاہزادی حضرت امام حسینؓ کے نکاح میں آئیں اور آخر تک زندہ رہیں۔ حضرت امام زین العابدینؓ جن سے خاندانِ اہل بیت کا سلسلہ نسب شہادت حسینؓ کے بعد شروع ہوا ہے وہ حضرت شہربانوؓ بنت یزدگرد شہنشاہ ایران کے بطن سے تھے۔ جیسا کہ پروفیسر براؤن نے بھی تاریخ ادبیات ایران میں لکھا ہے۔

اس سلسلے میں طبری کی ایک روایت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ تاریخ الامم والملوک میں طبری نے لکھا ہے کہ حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ نے حضرت عثمانؓ کے عہد میں طبرستان کے خلاف جہاد میں حصہ لیا۔ یہ ۳۰ھ کا واقعہ ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے کہا ہے کہ یزدگرد ۳۱ھ میں مرو پہنچ کر قتل ہوا اور اس کے بعد فارس کے اس آخری شہنشاہ کی جدوجہد ہمیشہ کے لیے

ختم ہوگئی۔ قرین قیاس یہ ہے کہ شہزادی شہر بانو ۳۱ھ میں باپ کی موت کے بعد بے یار و مددگار ہوکر گرفتار ہوئیں اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ طبرستان پر لشکر کشی کے وقت شہزادی شہربانو مسلمان ہوکر حضرت امام حسینؓ کے عقد میں آگئی ہوں۔

ہمیں اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں کہ شہزادی شہربانو کب اور کن حالات میں مسلمان ہوکر حضرت امام حسینؓ کے حرم میں آئیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ برضا و رغبت مشرف بہ اسلام ہوئیں اور انہوں نے اپنی مرضی سے حضرت امام حسینؓ کے ساتھ عقد کیا۔ اس کے بعد شہزادی شہربانو کی زندگی میں ایک فقید المثال انقلاب رونما ہوا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ عورتوں کو عمدہ اور قیمتی ملبوسات، طرح طرح کے زیورات اور آرام و آسائش کے لوازمات سے بڑی محبت ہوتی ہے۔ ایک عام عورت شاید ہی اپنے زیورات اور قیمتی سامان سے محروم ہونا پسند کرتی ہو۔ مگر دنیا کے ایک بہت بڑے شہنشاہ کی بیٹی نے اپنے عمل سے اس بات کو غلط ثابت کر دیا۔ اسلام کی دولت سمیٹنے کے بعد جب وہ حضرت امام حسینؓ کے گھر میں آئیں تو ان کا سراپا بدل چکا تھا۔ ان میں شہزادگی، فخر و غرور نخوت و تکبر اور شوقِ آرائش و زیبائش کا نام تک نہ تھا بلکہ کوئی پہچان بھی نہ سکتا تھا کہ یہ وہ عورت ہے جس کے قدموں تلے پورے ایران کی آنکھیں بچھی رہتی تھیں جس کی سواری مملکتِ فارس کے دارالسلطنت میں نکلتی تھی تو لوگ مؤدب ہوکر کھڑے ہو جاتے تھے اور نگاہیں شوکت و حشمت کے بار سے دب کر جھک جایا کرتی تھیں۔ دولت اور عشرت جن کے گھر کی کنیزیں تھیں اور شاہانہ نخوت و تکبر جنہیں وراثت میں ملا تھا جن کا ایک اشارہ کبھی وقت کی رفتار بدل دینے پر قادر تھا۔

اگرچہ یہ سب کچھ خواب و خیال ہوکر فارس کی عظمتِ خسروی کے ساتھ دفن ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود برسوں کی تربیت کا اثر نہیں جاتا۔ عادات و خصائل میں اتنی آسانی سے تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ پیدائشی عقائد و خیالات اور آبائی تعصبات کسی جبر اور سخت گیری

کے خوف سے فنا نہیں ہو سکتے۔ جس خاتون نے اس شان و شوکت اور کرّ و فر کے ساتھ زندگی بسر کی ہو اس کے انداز اور شاہانہ ادائیں یک لخت کیسے تبدیل ہو سکتی ہیں؟ مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ سب کچھ ہُوا۔ حضرت شہر بانوؓ نے اس گھر میں قدم رکھا تھا جس کی فضا ہر وقت اللہ کی حمد و تقدیس سے معمور رہتی تھی۔ جہاں حضرت زینبؓ کا تقوےٰ ہر وقت غبارِ رحمت بن کر چھایا رہتا تھا۔ یہ وہ گھر تھا جس پر حضرت فاطمہؓ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تقدس کا نور محیط رہتا تھا۔ یہ کاشانۂ نبوت تھا جس کا ہر ذرہ عرفان و معرفت کے انوار میں ڈوبا ہُوا تھا۔ یہ وہ گھر تھا جس کی مقدس روشنی سے دنیا کا ہر کونہ جگمگا اٹھا تھا جس پر حیدرِ کرّار حضرت علی المرتضےٰ کی درویشانہ زندگی کا تسلط تھا۔ یہ وہ کان تھی جس میں پتھر بھی چلا جائے تو پارس بن کر نکلتا تھا۔ اس گھر میں وہ لوگ رہتے تھے جو دلوں کی دنیا میں ایک نگاہ غلط انداز سے انقلاب برپا کر دیتے تھے۔ اس گھر کی روحانی فضائے فارس کی اس لاڈلی شہزادی کو فقر و استغنائے کے پیکر میں اس طرح ڈھال دیا کہ دنیا اپنی تمام خوبصورتی اور حسن و کشش کے ساتھ ہیچ نظر آنے لگی۔ اسلام کی تعلیم نے ان کا ظاہر و باطن بدل ڈالا۔ جبر کی طاقت سے صرف ظاہر کو بدلا جا سکتا ہے مگر دل و روح پر حکومت نہیں کی جا سکتی۔ اہلبیت کے فیضانِ نظر نے اس شہزادی کے دل کو ایک نئے انقلاب سے روشناس کیا۔ ہمیں حضرت شہر بانوؓ میں جو حیرت انگیز تبدیلی نظر آتی ہے وہ قلب و نظر کی تبدیلی تھی جس نے ان کی پوری زندگی کا رخ بدل ڈالا اور وہ جاہ و حشم کی پروردہ شہزادی ایک درویش منش اور سخت کوش مومنہ دکھائی دینے لگی۔ حضرت شہر بانوؓ نے اس کے بعد بے مثل سادگی اور انکسار کے ساتھ زندگی بسر کی اور وہ ہمہ وقت حضرت امام حسینؓ کی خدمت میں مصروف رہتی تھیں۔ انہیں ایک لمحہ کیلئے بھی اپنے عظیم المرتبت خاوند سے جدا ہونا گوارا نہ تھا۔ خدا کی قسم دل کی دنیا میں یہ انقلاب آجانے کے بعد اگر کوئی ان کے سامنے ملک فارس کی فرماں روائی

اور حضرت امام حسینؑ کی رفاقت میں سے کوئی ایک چیز پیش کرتا تو ان کی طرف سے یہی جواب ملتا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے ایک نقشِ پا پر روم و فارس کی ہزاروں سلطنتیں قربان کرنے کو تیار ہوں۔

سنہ ۶۱ھ میں جب حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے مقتل یعنی میدان کربلا کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت شہربانوؑ بھی ساتھ تھیں۔ اور وہیں انہوں نے خاندان اہلِ بیت کے ساتھ وہ تمام سختیاں برداشت کیں اور وہ تمام مصائب سہے جن کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں ـــــ ایران کی اس نازک اندام اور ناز پروردہ شہزادی نے اپنے جلیل القدر خاوند کے ساتھ بھوک اور پیاس کا عذاب برداشت کیا۔ ننھے اور معصوم علی اکبرؑ کی شہادت کا منظر دیکھا اور اپنے سرتاج کو بے کسی اور غریب الوطنی کی حالت میں شہید ہوتے دیکھا۔ ان کے نیزے پر چڑھے ہوئے سر کا قیامت خیز منظر دیکھا۔ ان کے گھوڑوں کے ٹاپوں سے روندی ہوئی نعش کو کلیجہ تھام کر دیکھا ـــــ کوفہ اور دمشق کے بازاروں میں مخدراتِ اہل بیت کے ساتھ برہنہ سر انہیں بھی ظلم و عدوان کے دربار کی روایات کا نشانہ بننا پڑا۔ انہوں نے اپنے بیمار اور نڈھال لختِ جگر امام زین العابدین کو پابندِ سلاسل دیکھ کر کئی بار نیلگوں آسمان کی طرف پرنم آنکھیں اٹھائیں۔ مگر راہ صدق و صفا سے انحراف گوارا نہ کیا۔ آخر وقت تک اپنے بیٹے حضرت امام زین العابدین کے ساتھ مدینہ منورہ میں رہیں۔

کہاں کسریٰ کا وہ رشکِ جناں محل جسے دیکھ کر غازیانِ اسلام بھی حیران و ششدر رہ گئے تھے اور کہاں یہ ریگ زار کربلا۔ کہاں وہ عیش و عشرت کی رنگین زندگی کہ بہاریں بھی رشک کریں اور کہاں یہ غریب الوطنی اور آبلہ پائی ـــ کہاں وہ عظمت و شوکت کہ ایک عالم سر جھکائے کھڑا ہے اور کہاں یہ کوفہ و دمشق کے بازاروں میں شکستہ حال بدنصیبوں کا جلوس۔ وہ کیسے لوگ تھے، کیسی سعید روحیں تھیں جنہوں نے تاریخ عالم کو حیاتِ جاوید عطا کی اور کہاں یہ ہماری

بد نصیب خواتین جن کے لئے اسلام ایک بھولا بسرا افسانہ ہے۔ جنہیں اپنے بزرگوں، اپنی تہذیب اپنے تمدن اور اپنے آباؤ اجداد کی درخشندہ روایات سے نفرت ہے۔ خدا کی قسم ہماری یہ لاکھوں دنیا پرست نام نہاد مسلمان عورتیں اس فارس کی شہزادی کے قدموں پر نثار کر دینے کے قابل ہیں۔ ان کے لئے گھر کی ایک معمولی سی تکلیف عذاب الٰہی بن جاتی ہے روزمرہ کی ضروریات میں ذراسی کمی انہیں ناشکری کی حد سے بھی آگے لے جاتی ہے۔ کسی عزیز کی موت پر وہ نعوذ باللہ خدا کو کوسنے لگتی ہیں۔ سوچ لیجئے! اگر دنیا میں مسلمان بن کر جینا ہے تو دنیا یا دین ان دو میں سے ایک کو منتخب کرنا ہوگا۔ مسلمان عورت دنیا کی نہیں خدا کی پرستش کرتی ہے اور دنیا اس کے دین کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ ورنہ خدا کا قانون مکافات کسی قوم سے رعایت نہیں کرتا جب قیصر و کسریٰ نے حدود سے تجاوز کیا تو ان کی شوکت و حشمت اور قوت و طاقت ان کے گلے کا پھندا بن گئی۔ وہ جھرنے آب کبھی زندہ نہیں رہ سکتی جو اپنے سرچشمہ سے کٹ جائے۔ ان دریاؤں کا دامن روانی کی دولت سے خالی ہو جاتا ہے جو اپنے مخزن سے بیگانہ ہو جائیں۔ وہ درخت کبھی سرسبز و شاداب نہیں رہ سکتا جو اپنی جڑوں سے بے تعلق ہو جائے۔ وہ کہانی ہمیشہ پریشان خیالی کا مجموعہ بن جاتی ہے جو اپنے مرکزی خیال سے آزاد ہو جائے۔ قدرت اس چشمے کو ترنم سے محروم کر دیتی ہے جو اپنی بنیاد سے بے تعلق ہو جائے۔

سورج کی شعاعیں اور چاند کی کرنیں اسی وقت تک حیات آفرین ہیں جب تک انکا تعلق چاند اور سورج سے قائم ہے آج ہم اپنے منبع حیات سے کٹ جانے کی فکر میں ہیں ہم اپنے گھر کے جگمگاتے ہوئے چراغوں کو چھوڑ کر اڑتے ہوئے جگنوؤں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔۔۔ خدا کرے کہ ہم اس مینار نور کی طرف لوٹ آئیں جن کی روشنی حسرت سے ہمارا انتظار کر رہی ہے۔

یاد رکھو! اس بات کے مقدر کا ستارہ صرف اس بہن کے نہاں خانہ قلب میں جگمگا سکتا ہے جو سیرت زینب سے روشنی حاصل کرے۔ اس بیٹی کی عظمت اسے تابندگی دے سکتی ہے جس کا تعلق فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو اور اس بیوی کا آغوش اسے رشک ماہتاب بنا سکتا ہے جس نے خدیجۃ الکبریٰ عائشہ صدیقہ اور دیگر امہات المومنین کے اوصاف کو وراثت میں پایا ہو۔

حضرت بکارہؓ

بکارہؒ فصیح و بلیغ شاعرہ تھیں جن کے اشعار میں
حق و صداقت کی روح شعریت بن کر رچی ہوئی تھی
ان کی صاف گوئی اور بے باکی نے امیر معاویہؓ سے
بھی خراجِ تحسین حاصل کیا۔ افلاس کے دور میں بھی
انہوں نے اپنے کردار کی عظمت کو کسی قیمت پر بیچنا
گوارا نہیں کیا۔

بکارہؒ

بکارہ کا تعلق عرب کے قبیلہ ہلال سے تھا۔ فہم و تدبّر میں بے مثل، صاف گوئی اور بے باکی کی دلکش تصویر اور عرب کی خوش بیان شاعرہ تھیں۔ ابتدائی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں آپ کا ذکر ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ سے آپ کو بے پناہ عقیدت تھی۔ انہوں نے اپنے اشعار میں حضرت علیؓ کی بہت زیادہ مدح اور ستائش کی ہے۔ حضرت عثمانؓ ذوالنورّین کی شہادت کے بعد جب ایک مفسد گروہ نے فتنہ پردازی کا سلسلہ شروع کیا اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے اور باہمی اختلافات کو ہوا دینے کے لئے طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلانا شروع کیں تو بعض لوگ حضرت علیؓ سے بھی گستاخی سے پیش آئے اور انہوں نے دوران گفتگو ادب و احترام کو ملحوظ نہ رکھا تو بکارہ کو بہت رنج ہُوا۔ انہوں نے نہایت مؤثر انداز میں اشعار کے ذریعہ لوگوں پر حضرت علیؓ کا مرتبہ اور شرف واضح کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی۔ کئی لوگوں نے ان کے اشعار سے متاثر ہو کر حضرت علیؓ کی مخالفت ترک کر دی۔

بعد میں جب حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے باہمی جھگڑے کا افسوسناک سلسلہ شروع ہُوا اور امیر معاویہ نے کھل کر حضرت علیؓ کا مقابلہ شروع کر دیا تو بکارہؒ نے اپنے اشعار کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں حضرت علیؓ کی محبت اور رفاقت کی آگ سی بھڑکا دی۔ چونکہ انہیں خود حضرت علیؓ سے بے حد عقیدت تھی اور وہ اس جھگڑے میں حضرت علیؓ کو نہایت خلوص اور دیانت داری سے راستی پر سمجھتی تھیں۔ اس لئے ان کی دلی خواہش تھی

کہ تمام مسلمان حضرت علیؓ کا ساتھ دیں۔ ہمیں واقعات کی نوعیت اور اختلافات پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ عرب کی ایک راست گو۔ مخلص اور اسلام کی شیدائی خاتون نے بنیادی طور پر کس جذبے کے ساتھ اس موقع پر ایک واضح کردار ادا کیا اور اس سلسلے میں کہاں تک صبر و استقلال کا ثبوت دیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ سے ان کی کوئی دنیوی غرض وابستہ نہ تھی۔ اور نہ ہی کوئی لالچ تھا کہ حضرت علیؓ کامیاب ہو جائیں۔ تو وہ کسی قسم کا فائدہ اٹھائیں۔ ذاتی طور پر حضرت علی المرتضٰے درویش منش انسان تھے اور بالکل سادہ سی زندگی بسر کرتے ہیں وہ اس شاعرہ کو کیا مالی اور دنیوی فائدہ پہنچا سکتے تھے عورت ہونے کی حیثیت سے انہیں کوئی بڑا اعزاز نہ مل سکتا تھا۔ ویسے بھی حضرت علیؓ غیر منصفانہ نوازشات کے عادی نہ تھے۔ اس کے علاوہ بکارہ کی کوئی سیاسی مصلحت نہ تھی اور نہ حضرت علیؓ کے خاندان سے ان کی قرابتداری ہی تھی کہ وہ ان کی حمایت کے لئے مجبور ہوتیں۔ البتہ دوسری طرف انعامات و اکرامات کی اندھا دھند بارش ہو رہی تھی۔ امیر معاویہؓ کی فیاضی اور دریا دلی ان کے تمام ساتھیوں کو سیراب کر رہی تھی اس وقت بھی ان کے دربار سے کوئی شخص خالی ہاتھ واپس نہ آتا تھا۔ اگر حضرت بکارہؓ امیر معاویہ کا ساتھ دیتیں اس حالت میں کہ عرب کے تمام حصوں میں ان کے اشعار بجلی کی سی تیزی سے زبان زد عام ہو جاتے تھے۔ اور وہ عوام کے دلوں اور ذہنوں کو متاثر کرتی تھیں۔ ان کے کلام میں طوفان کا سا زور، سمندر کی سی روانی اور بجلی کی سی کاٹ تھی۔ وہ جہاں اشعار پڑھتی تھیں لوگوں کو مسحور کر دیتی تھیں۔ امیر معاویہؓ ایسے زیرک اور معاملہ فہم سیاست دان کے لئے بکارہ کا وجود بہت قیمتی تھا اور وہاں ان کے ہر شعر کو موتیوں سے تول کر قبول کیا جاتا یہ سب کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہوئے حضرت بکارہؓ نے حضرت علیؓ کا کھلے بندوں ساتھ دیا کیونکہ ان کے ضمیر کا فیصلہ یہی تھا کہ حضرت علیؓ راستی پر ہیں۔ اور ہر لحاظ سے امیر معاویہؓ پر بھاری ہیں۔ ایک دفعہ جب انہوں نے فیصلہ

کر لیا تو پھر کسی منفعت اور مصلحت کو زنجیر پا بننے کی اجازت نہیں دی بلکہ ہر جگہ امیر معاویہؓ کی شدید مخالفت کی۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر انہوں نے حضرت علی مرتضےٰ کے محاسن انتہائی دل نشین پیرائے میں بیان کیے اور لوگوں کو امیر معاویہ کے خلاف بھڑکانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ انہوں نے ہر موقع پر اپنے اشعار میں امیر معاویہؓ کی جی بھر کے مذمت کی اور اس بات پر سخت رنج اور برہمی کا اظہار کیا کہ امیر معاویہؓ نے اپنی حدود سے تجاوز کر کے خلیفۃ المسلمین حضرت علیؓ کے خلاف تلوار اٹھائی اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا۔ حالات کچھ بھی ہوں یہ اور آج کسی بھی فریق کو راستی پر قرار دیا جاتے مگر بکارہ کے لیے یہ صورتِ حال نہایت تکلیف دہ تھی کہ ایک مسلمان کے ہاتھ دوسرے مسلمان کے خون سے رنگین ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کے اپنے خون سے ایک ایسے فتنے کی پرورش ہو رہی ہے جو ملتِ اسلامیہ کی جڑوں کو کھوکھلا کر دینے والا ہے۔ ان کے نزدیک امیر معاویہؓ کا فرض تھا کہ وہ خلیفۂ وقت حضرت علیؓ کے احکام کی بسر و چشم تعمیل کرتے اور ان کے مقابل کسی صورت دشمن فریق بن کر کھڑے نہ ہوتے۔

درحقیقت اسی آویزش نے آگے چل کر حادثۂ کربلا کی المناک صورت اختیار کی۔ بکارہؓ نے امیر معاویہؓ کے خلاف جتنے اشعار کہے تھے وہ عوام میں بے حد مقبول ہو چکے تھے اور بے شمار لوگوں کو یاد تھے۔ حالات نے فیصلہ حضرت علیؓ کے خلاف دیا۔ اور طویل کشمکش کے بعد امیر معاویہ کے تدبر اور ان کی سیاست نے بازی جیت لی حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے برملا اپنی خلافت کا اعلان کر دیا کیونکہ اب ان کا کوئی بھی مضبوط حریف باقی نہ رہا تھا۔ جہاں ان کی سیاست ناکام ہوئی انہوں نے زر و سیم اور چرب زبانی کا جال پھیلا کر لوگوں کو اسیر کر لیا جہاں یہ دونوں چیزیں بیکار ثابت ہوئیں انہوں نے بلا دریغ طاقت استعمال کی۔ حضرت علیؓ کے حامیوں کا زور زیادہ تر ٹوٹ چکا تھا اور جہاں تھوڑی بہت بے چینی تھی اس کی حیثیت بھی مقامی رہ گئی تھی۔

اپنی خلافت کا اعلان کرنے کے بعد جب امیر معاویہؓ اطمینان و سکون سے بلادِ اسلامیہ پر حکومت کرنے لگے تو انہیں معلوم ہوا کہ بکارہ جو عرب کی ایک نامور اور ممتاز شاعرہ ہیں نہایت تنگ دستی اور مفلوک الحالی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ انہوں نے فی الفور حجاز کے گورنر کو لکھا کہ بکارہ کو ان کے دربار میں حاضر کیا جائے۔ جب امیر معاویہؓ کے دربار میں حاضر ہوئیں تو انہوں نے پوچھا۔

"کیا تم وہی بکارہ ہو جو میرے متعلق توہین آمیز اشعار کہتی تھی؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں میں وہی بکارہ ہوں"

امیر معاویہ کے ایک معزز درباری مروان بن حکم نے امیر کو مشتعل کرنے کے لئے بکارہ کے کچھ ایسے اشعار سنائے جن میں امیر معاویہؓ کی خوب مذمت کی گئی تھی امیر معاویہؓ نے ایک منجھے ہوئے مدبر کے انداز میں پوچھا کہ کیا یہ تمہارے اشعار ہیں ان کا خیال تھا کہ میری صولت و حشمت سے مرعوب ہو کر اب یہ یقیناً انکار کر دیں گی مگر بکارہ نے انہیں یہ جواب دے کر حیران و ششدر کر دیا۔

"اے معاویہ! انکار کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں اور مجھے جھوٹی خوشامد کی عادت نہیں۔ یہ سب اشعار میرے ہیں لیکن جو کلام اس سنانے والے کو ابھی تک معلوم نہیں وہ اس سے بھی زیادہ سخت ہے"

یہ جواب سن کر امیر معاویہؓ ہنسے اور کہا لیکن یہ بات مجھے تمہاری امداد و اعانت سے نہیں روک سکتی۔ بکارہ نے جواب دیا۔ میں کوئی حاجت لے کر تمہارے پاس نہیں آئی۔ امیر معاویہ نے پھر کہا کہ تاہم تم بیان کر دیں تمہاری حاجت پوری کروں گا یہ بڑھتا ہوا اصرار دیکھ کر بکارہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور یہ کہہ کر چل دیں کہ اس بے لطفی کے بعد حاجت کا اظہار مناسب نہیں ہے۔

اس سے قبل امیر معاویہؓ نے جب ان سے اپنی خلافت کے بارے میں چند چبھتے ہوئے سوالات کئے تو بکارہ نے بے خوف ہو کر کہا۔

"اے معاویہؓ! کیا ہم ابن ہند کو خلافت کا مالک سمجھیں۔ یہ دور از قیاس ہے اور اگر تو ایسا چاہتا ہے تو یہ تیرے مرتبے سے بہت بالاتر بات ہے۔ تیرے نفس نے گمراہی سے یہ آرزو تیرے دل میں ڈال دی ہے اور لوگوں نے تجھے بدبختی کے لئے ورغلایا ہے۔"

یہ سن کر امیر معاویہؓ کے حاشیہ نشینوں نے رائے دی کہ اس گستاخ عورت کو عبرتناک سزا دینی چاہیئے تاکہ دوسروں کو سبق حاصل ہو۔ مگر امیر معاویہؓ نے کہا۔

"نہیں، ہرگز نہیں، ایک صاف گو عورت کو سزا دینا قرین انصاف نہیں بلکہ وہ عزت و احترام کی مستحق ہے کہ وہ مرعوب نہیں ہوئی۔ اب بھی اس کی یہ حالت ہے کہ جو اس کے دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر آتا ہے۔"

یہ چند جملے جہاں امیر معاویہ کی بلند حوصلگی اور عالی ظرفی ظاہر کرتے ہیں وہاں بکارہؓ کے شاندار کردار کو بہت زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔

آج ہماری جو بہنیں شعر و سخن کے میدان میں طبع آزمائی بھی کرتی ہیں تو ان کی جولانگاہ سفلی جذبات اور حسن و عشق کے عامیانہ مضامین سے آگے نہیں بڑھتی کیا انہیں تقلید کے لئے خنساءؓ اور بکارہ کی جرأت و بے باکی، اسلام دوستی، ملت پروری اور بلند کرداری پسند نہیں؟ کیا یہ ان کا جذبۂ ایمان، خلوص اور صدق و صفا کے مظاہر نہ تھے جنہوں نے ان ہستیوں کو زندۂ جاوید بنا دیا اور آج ہم ان پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔

کذرقاء

ایمان و استقامت، جرأت و شجاعت اور
بے خوفی کا وہ نقشِ جمیل ہے جو انسانی آزادی،
حریت، مساوات اور شرف و امتیاز کے سر پر
لافانی تاج بن کر جگمگاتا رہے گا۔ زرقا اور ان ایسی
بلند کردار مسلمان خواتین، اس حقیقت کا مجسم ثبوت
ہیں کہ اسلام کے بعد دنیا کا کوئی بڑے سے
بڑا فلسفۂ حیات اور عظیم سے عظیم نظریۂ زندگی
بھی انسانی عظمت کی ان بلندیوں کو نہیں چھو سکے گا
جو مسلمانوں کے لیئے نشانِ منزل کی حیثیت
رکھتی تھیں۔

زرقاء

زرقاء عدی بن قیس کی بیٹی تھیں، عرب کی ممتاز شاعرات میں شمار ہوتی تھیں اور شعلہ بیان خطیبہ تھیں۔ علم و فن میں انہیں قابلِ فخر امتیاز حاصل تھا۔ اور نہایت شیریں بیان تھیں۔ شخصی دورِ حکومت کے بعض خوشامدی داستان نویسوں نے ان کے کردار کی عظمت کو چھپانے کے لئے کئی قسم کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں اور انہیں ایک مغنیہ کے روپ میں پیش کرنے کے لئے طرح طرح کی افسانہ طرازیاں کی ہیں۔ حالانکہ وہ ایک صاحبِ طرز شاعرہ تھیں۔ اور ان کا دل اسلام کی والہانہ محبت سے ہر وقت سرشار رہتا تھا۔ ان کے اشعار اور تقاریر میں ملت اسلامیہ کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اور وہ اپنے وقت کی ایک ایسی خدا پرست، صداقت شعار اور خلوص کیش خاتون تھیں جن کی خودداری اور دیانت کا بدترین دشمن بھی اعتراف کرتے تھے۔

حضرت علی المرتضٰی کے دورِ خلافت میں زرقاء اپنے قبیلے کے ساتھ حضرت علیؓ کے حلیفوں میں شامل تھیں۔ اور حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ سوم کی دردناک شہادت کے بعد حضرت علیؓ کو خلافت کا مستحق سمجھتی تھیں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جنگ صفین کے موقع پر یہ آتش بیان شاعرہ اور مقررہ میدانِ جنگ میں غضب کے پرجوش اشعار پڑھ کر اپنے قبیلے کے لوگوں کے حوصلے بڑھا رہی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ زرقاء کے اشعار اتنے پردرد اور اثر انگیز تھے کہ ان کا قبیلہ امیر معاویہ کے خلاف جوش و خروش کے عالم میں

دیوانہ وار لڑ رہا تھا۔

جب امیر معاویہ تخت خلافت پر قبضہ کر چکے اور اطمینان و سکون سے بلادِ اسلامیہ پر حکومت کرنے لگے تو ایک روز ان کی مجلس میں عمرو بن سعید، عتبہ اور ولید وغیرہ نے امیر معاویہ کو زرقاء کے کئی اشعار سنائے اور بتایا کہ زرقاء کی جادو بیانی نے کئی دفعہ لڑائی کا رخ بدل دیا۔ صرف ان کے اشعار کی وجہ سے عدی بن قیس کا قبیلہ بے پناہ جوش کے ساتھ آخر دم تک لڑتا رہا۔ یہ تفصیل سن کر امیر معاویہؓ نے اپنے ان مصاحبین سے پوچھا کہ تمہاری رائے میں ایسی عورت کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ سب نے اتفاق رائے سے مشورہ دیا کہ ایسی باغی عورت کو قتل کر دینا بہت ضروری ہے تاکہ دوسرے لوگ اس کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔ اور آئندہ کسی کو امیر کے خلاف اس قسم کی باتیں کہنے کی جرأت نہ ہو۔ امیر معاویہ نے اس مشورے کو سخت ناپسند کیا اور بڑی ترشروئی کے ساتھ جواب دیا۔

"کیا تم مجھے ایک ایسی عورت کا قاتل مشہور کر کے دنیا میں بدنام کرنا چاہتے ہو جو اس وقت میرے ملک کی حدود میں رہتی ہے اور میرے قابو میں ہے؟"

بہادری اور شجاعت کے قدردان اور عاقبت اندیش امیر معاویہؓ کا یہ جواب سن کر خوشامدی امراء بہت شرمندہ ہوئے اور ان کے چہرے زرد پڑ گئے۔ کیونکہ انہوں نے تو امیر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایسا مشورہ دیا تھا۔

زرقاء اتفاق سے اس وقت کوفہ میں تھیں۔ امیر معاویہؓ نے کوفہ کے گورنر کو فوراً خط لکھا کہ زرقاء کو انتہائی عزت و احترام کے ساتھ اپنے چند معتمد آدمیوں اور اس کے قبیلے کے ذمہ دار سرداروں کے ہمراہ میرے پاس بھیجو۔ کوفہ کے گورنر نے یہ حکم پڑھتے ہی زرقاء کو طلب کیا اور امیر معاویہ کا یہ پیغام سنایا۔ زرقاء نے بڑے اطمینان

سے یہ پیغام سن کر کہا کہ اگر امیر نے میرا وہاں جانا میری مرضی پر چھوڑا ہے تو میں جانے سے صاف انکار کرتی ہوں اگر یہ ان کا قطعی حکم ہے تو مجبوری کے عالم میں جانے کو تیار ہوں مگر گورنر کوفہ نے انہیں سمجھا بجھا کر بڑے تزک و احتشام سے امیر معاویہؓ کے پاس روانہ کر دیا۔ جب امیر معاویہ کے دربار میں پیش ہوئیں تو امیر نے پوچھا کہو زرقا سفر کیسے طے ہوا۔

زرقا۔ جس طرح لڑکی ماں کی گود میں پرورش پاتی ہے یا بچہ گہوارے میں سوتا ہے۔

امیر معاویہ۔ ہم نے اپنے گورنر کو یہی ہدایت کی تھی مگر تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کیوں یہاں طلب کیا ہے؟

زرقا۔ جو راز مجھ سے پوشیدہ ہے اس سے میں کیسے آگاہ ہو سکتی ہوں۔

امیر معاویہ۔ زرقا! تم یہ بتاؤ کہ کیا جنگ صفین کے موقع پر تم سرخ اونٹ پر سوار تھیں؟

زرقا۔ ہو سکتا ہے۔

امیر معاویہ۔ کیا تو اپنے آتشیں اشعار اور تند و تیز تقریروں سے جنگ کی آگ بھڑکانے میں مصروف نہ تھی؟ اور کیا تو لوگوں کو قتل و خون کے لئے نہیں بھڑکا رہی تھی؟

زرقا۔ آپ جانتے ہیں کہ زمانہ انقلاب انگیز ہے۔ ایسا ہونا ممکن ہے۔

معاویہ۔ کیوں تجھے اپنی وہ تقریر یاد ہے جو تم نے جنگ صفین کے موقع پر کی تھی۔

زرقا۔ واللہ! مجھے یاد نہیں۔

معاویہ۔ مگر مجھے تو یاد ہے ـــ سنو! تم نے حضرت علیؓ کی فوج اور اپنے قبیلے کے نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ تم اس فتنے سے بچو جو تم پر ظلمت کے پردے ڈال رہا ہے۔ اور لوگوں کو راہ راست سے گمراہ کر رہا ہے یہ کیسا اندھا بہرا اور گونگا فتنہ ہے۔ اے مجاہدین! یاد رکھو! عورتوں کی آرائش و زیبائش

مہندی سے ہے مگر مردوں کا حسن خون سے دوبالا ہوتا ہے ____ تقریر کا مختصر سا حصہ سنا کر امیر معاویہؓ نے بڑی رعب دار آواز میں پوچھا: کیا تو علیؓ کے ساتھ شریک تھی؟

زرقاء: اے معاویہ! خدا آپ کا بھلا کرے۔ آپ نے بھولے بسرے واقعات دہرا کر میرے دل کو پھر جوش اور ولولے سے معمور کر دیا ہے اور میری مردہ روح کو نئی تازگی بخش دی ہے میری رگوں میں تازہ خون دوڑا دیا ہے۔

امیر معاویہ۔ کیا تو علیؓ کا ساتھ دینے پر اب بھی خوش ہے؟

زرقاء۔ خوش ہی نہیں مجھے اس پر فخر ہے۔

یہ سن کر امیر معاویہ جھینپ سے گئے۔ اور توقف کے بعد کہا۔

اے زرقاء! علیؓ سے تیری یہ وفاداری اور وفات کے بعد اس میں یہ استواری ہر لحاظ سے قابلِ عزت اور باعث رشک ہے۔ تمہارے اس جواب سے میرے دل میں تمہاری قدر و منزلت بہت بڑھ گئی ہے۔ آج تمہیں جس چیز کی خواہش ہے مانگو۔ تیرے جیسی علم دوست، لائق، ذہین، وفادار اور حق گو عورت کی ضروریات کو پورا کرنا میرا فرض ہے۔

زرقاء۔ جس شخص کے خلاف میں نفرت انگیز خیالات کا اظہار کرتی رہی، فوجوں کو بھڑکاتی رہی اور اس کے خلاف لوگوں کو آمادہ پیکار کرتی رہی کیا آج اس کے سامنے دستِ سوال دراز کروں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ مگر زرقاء کے انکار کے باوجود امیر معاویہؓ نے اسے بے شمار تحائف اور انعامات دے کر انتہائی عزت و توقیر کے ساتھ رخصت کیا نہ صرف زرقاء کو بلکہ اس کے قبیلہ والوں کو بھی امیر معاویہ نے بڑی فراخدلی سے نوازا۔

اپنے گھر میں بیٹھ کر دوسروں کو برا بھلا کہہ لینا اور کوس کر جی ٹھنڈا کر لینا بہت آسان

کام ہے ویسے بھی عام عورتوں کا یہ جذبہ مشغلہ ہوتا ہے مگر ایک صاحب اختیار فرماں روا کے دربار میں کھڑے ہو کر اعلانِ حق کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں پھر ایسا حکمران جس کے متعلق صاف طور پر معلوم ہو کہ وہ دشمن ہے اور اس کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیئے کسی نے امکانی کوشش بھی کی ہو جو ہر دوست اور دشمن پر عیاں ہو۔ ایسے موقع پر سچائی کا دامن تھامے رکھنا اور پوری جرأت و بے باکی کے ساتھ اپنے دلی خیالات کا اظہار کرنا بہت کٹھن کام ہے۔ ایسے مواقع پر بڑے بڑے دلیر اور جنگجو مردوں کے پاؤں بھی ڈگمگا جاتے ہیں اور وہ اپنی آنکھوں کے سامنے موت کا رقص دیکھ کر لرزہ براندام ہو جاتے ہیں مگر اسلامی تعلیم کے سرچشمۂ صداقت سے سیراب ہونے والی اس بہادر اور حق پرست خاتون کو دیکھیئے کہ وہ حاکم وقت کی جلالت اور سطوت سے ذرہ برابر مرعوب نہیں ہوتی اور اس کے پائے ثبات کو بالکل لغزش نہیں ہوتی حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ امیر معاویہ ان کے کسی بھی جملے کو گستاخی پر محمول کر کے ایک اشارۂ ابرو کے ساتھ ان کی زندگی کا خاتمہ کر سکتے تھے مگر جہاں امیر معاویہؓ کی دانش مندی، بردباری اور شجاعت نے ایک وفادار اور راست گفتار عورت کے خون سے اپنا دامن آلودہ کرنا گوارا نہ کیا وہاں زرقاء نے بھی اس کے عفو و کرم کے جذبات کو بیدار کرنے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی۔ اور نہ ان سے رحم و کرم کی بھیک مانگنا گوارا کیا۔ بلکہ بڑی دیانتداری کے ساتھ اپنے جذبات و احساسات کو بلیغ انداز میں پیش کر دیا۔ کتنی بلند تھیں وہ عورتیں اور کیسی کیسی بلندیاں ان کے جگمگاتے ہوئے کردار کے سامنے سرنگوں ہو جاتی تھیں سچائی اور صداقت کسی صفائی کی محتاج نہیں ہوتی۔ ایک باضمیر مسلمان عورت کی رائے کوئی شہنشاہ وقت قارون کے خزانے دے کر بھی نہیں خرید سکتا۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی سچی بات کہتی ہے اور تلواروں کے سائے میں بھی حق کا اعلان کرنے سے اسے کوئی خوف روک نہیں سکتا۔

... کہاں آج کی حق ناآشنا عورت کہ چھوٹی چھوٹی اغراض اور معمولی مصلحتوں پر ایمان و ضمیر بیچ دیتی ہے۔ معمولی سا لالچ اسے سچائی کے راستے سے منحرف کر دیتا ہے دور دراز کی رشتہ داری اور تعلقات کو بچانے اور جھوٹے وقار کو قائم رکھنے کے لئے وہ بڑے سے بڑا جھوٹ بولنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ دوسروں پر خوفناک الزامات لگانے اور بے سر و پا بہتان تراشنے ہی میں اپنی بڑائی سمجھتی ہے۔

اگر ہماری بہنوں کو اللہ نے ذرا بھی عقلِ سلیم دی ہے تو وہ زرقاء کی طرف دیکھ کر سبق حاصل کریں کہ اسلام کے بنیادی تقاضے کیا ہیں اور مسلمان عورت کا سب سے بڑا وصف کیا ہوتا ہے۔

اُمِّ علقمہ

ام علقمہ کا وجود ظلم و ستم کے منہ پر ایک
زبردست طمانچہ ہے جو جور و عدوان کی ہنسی اڑانے
والی اور موت کا پر ہیبت چہرہ دیکھ کر مسکرانے
والی بے خوف اور نڈر خاتون کو دیکھنے کی آرزو
ہو تو ام علقمہ کو دیکھ لو۔

اُمّ علقمہ

کون نہیں جانتا کہ تاریخ اسلام میں سب سے زیادہ ظالم اور خونخوار شخص کون تھا، حجّاج بن یوسف ثقفی جس کے سیاہ کارناموں سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔ جس کے دامن پر ہزاروں بے گناہوں کے خونِ ناحق کے دھبے آج بھی نظر آتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ لاکھوں ظالم مل کر بھی ایک حجّاج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کی خونخوار آنکھوں میں ناچنے والے شعلوں میں ہزاروں یزید، لاکھوں ابن زیاد اور سینکڑوں شمر جھلکتے رہتے تھے۔ وہ بظاہر انسان نظر آتا تھا مگر درحقیقت ظلم اور درندگی کے قالب میں ڈھلا ہوا خونخوار بھیڑیا تھا۔ جس کی شعلہ ریز آنکھیں خاک و خون میں تڑپتی ہوئی انسانی لاشوں کے مناظر سے ہی لطف اندوز ہو سکتی تھیں۔ جس کے کان صرف آہ و بکا اور نالہ و فریاد سے ہی سکون حاصل کر سکتے تھے جس کے ہاتھ ہمیشہ کسی نہ کسی کی گردن اڑانے کے لئے حرکت میں آتے تھے اور جس کے پاؤں صرف گناہ و معصیت کی وادی ہی سے آشنا تھے۔ جس بدنصیب دور میں اس شخص کو اقتدار حاصل تھا وہ حجاج ایسے شقی القلب اور پتھر دل انسان کی بدولت تاریخ کا ایک المناک باب بن کر رہ گیا ہے۔ اس دور کی تاریخ کے ہر لفظ سے آج بھی ہزاروں بے گناہوں کا خون ٹپک رہا ہے۔ اس پیکرِ ظلم و فساد نے سرکارِ دوعالم رحمۃ للعالمین کی مبارک تعلیمات کو انسانی خون کے دریا میں غرق کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی اور اسے انسانی گوشت پوست کے ڈھیروں تلے دبا دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ حجاج ایک ایسا ظالم،

خود پرست اور بے رحم شخص تھا جس کے سامنے دم مارنے اور ہونٹ ہلانے کا مطلب اپنی موت کو دعوت دینا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دور میں حجاج مسلمانوں کے لیئے عذاب الٰہی بن کر نازل ہوا تھا۔ اور اس کا صرف یہی کام تھا کہ مسلمانوں کا خون چاٹ کر زندہ رہے۔ وہ یوں تو ایک گورنر تھا مگر حقیقت میں اس کے اختیارات لامحدود تھے۔ اس کی ہر لحظہ بے نیام رہنے والی تلوار کسی بڑی سے بڑی ہستی کے مقام و مرتبہ کو بھی تسلیم کرنے کے لیئے تیار نہ تھی اور سب کے سروں پر یکساں طور پر لٹکتی رہتی تھی۔ حجاج کو اس بات سے کوئی علاقہ نہ تھا کہ کون کیا ہے اور اسکا مرتبہ و امتیاز کیا ہے؟ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ اس کے منہ سے نکلنے والے ہر لفظ کی بلاچون و چرا تعمیل کی جائے۔ اور ہر شخص کی گردن اس کے سامنے جھکی رہے اگر جھکنے کے لیئے تیار نہ ہو تو فوراً تن سے جدا کر دی جائے۔

اسی ظالم و جابر حجاج کے دربار میں ایک بہادر اور خدا پرست خاتون ام علقمہ کو گرفتار کر کے پیش کیا گیا۔ وہ جرأت و بسالت کی مجسم تفسیر جب حجاج کے روبرو آئی تو اس نے انتہائی نفرت اور حقارت سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور اس کی منحوس خونی صورت کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا۔ حجاج کے لیئے یہ طرز عمل نہ صرف حیران کن تھا بلکہ اس کی آتش غیظ و غضب کو بھڑکانے کے لیئے بھی کافی تھا حجاج نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں ام علقمہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اے خارجیہ! میرے منہ کی طرف دیکھو"

ام علقمہ۔ جو منہ بارگاہِ خداوندی سے مردود ہو چکا ہو اس کی طرف کیونکر دیکھوں۔

یہ ایک ہی جملہ حجاج ایسے خون آشام درندے کو ہوش و حواس سے بے نیاز کر دینے کیلئے بہت کافی تھا جس شخص کے سامنے آنے سے جری اور حوصلہ مند مرد پہلو بچاتے تھے اور اگر آتے تھے تو خاموشی سے اس کی خرافات اور بیہودہ باتوں

کو برداشت کرنے کے لئے مجبور ہوتے تھے اس کی جور پرستی کو ایک پابند غیر
عورت بھرے دربار میں للکار رہی تھی۔ بھلا حجاج یہ توہین کیسے برداشت کر سکتا تھا
اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور شدتِ غضب سے اس کا جسم کانپنے لگا۔

اس گستاخ عورت کے خون کے بارے میں تمہارا کیا فیصلہ ہے؟ اس نے اپنے حاشیہ نشین مصاحبوں سے مخاطب ہو کر پوچھا "اس کا خون حلال ہے" سب نے یک آواز جواب دیا۔ ظاہر ہے کہ جہاں حاکم حجاج ہو وہاں اس کے مصاحب کس درجہ کے ہوں گے اور ان سے اس کے علاوہ اور کس قسم کے جواب کی توقع ہو سکتی تھی۔ "اس کا خون حلال ہے" اس کا مطلب یہ تھا کہ ام علقمہ کے لئے سزائے موت کا حکم صادر ہو چکا ہے جس کے لئے اب دنیا کے کسی دربار میں فریاد نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ کوئی قانون اس اٹل فیصلے پر نظر ثانی کر سکتا تھا اور نہ اسے منسوخ کر سکتا تھا کیونکہ حجاج ایک ایسا حاکم تھا جو اپنی نوکِ شمشیر سے روزانہ نئے قوانین وضع کرتا تھا۔ اور انسانی خون سے انہیں ضبطِ تحریر میں لاتا تھا۔ یہ فیصلہ صادر ہونے کے بعد حجاج کے دستور کی رو سے دوسرے لمحہ ام علقمہ کی نعش خاک و خون میں غلطیدہ نظر آنا چاہیئے تھی۔

دوسری طرف تصور کیجئے کہ ایک گرفتار ہو کر آنے والی بے بس ولاچار مظلوم عورت اس فیصلے کے بعد کس حال میں ہو گی یقیناً موت اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مگر یقین کیجئے کہ ام علقمہ حجاج کے سامنے کھڑی موت پر مسکرا رہی تھی۔ جب حجاج نے دیکھا کہ وہ اپنے اختیار کو آخری حد تک استعمال کر چکا ہے مگر ایک کمزور اور بے بس عورت بڑی بے پروائی اور بے فکری کے ساتھ کھڑی زیر لب یوں مسکرا رہی ہے جیسے اس کے ظلم و ستم کا مذاق اڑا رہی ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی مسکرانے کا موقع تھا حجاج کے خیال میں تو اس وقت اس کے چہرے پر موت کی مردنی چھا جانی چاہیئے تھی۔ چاہیئے

تھا کہ اس کا سارا بدن خوف وہراس سے بید مجنوں کی طرح کانپنے لگ جاتا۔ اس کی خوف زدہ آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے اور وہ گڑگڑا کر حجاج کے قدموں پر گر پڑتی اور منت وزاری کے ساتھ یہ التجا کرتی کہ اے امیر! تو رحم وکرم کا فرشتہ ہے۔ میں قصوروار اور گناہگار ہوں۔ اور میری زندگی تیرے عفو وکرم کی محتاج ہے۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دے۔ امیر قصور بخش دے مگر حجاج اسے پائے حقارت سے ٹھکرا کر جلاد کو سر تن سے جدا کر دینے کا اشارہ کر دیتا ـــــ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ ام علقمہ نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اس کا چہرہ اسی طرح ہشاش بشاش اور شگفتہ تھا جس پر غم وفکر اور تردد کا معمولی سا اثر بھی نظر نہ آتا تھا۔ وہ اسی اطمینان وسکون سے کھڑی حجاج کی طرف دیکھ کر مسکراتی رہی۔ وہ سخت بے چین ہو گیا اور اسے اپنا وجود ام علقمہ کے سامنے دھنکی ہوئی روئی کی طرح اڑتا ہوا نظر آنے لگا۔ آخر وہ نہ رہ سکا اور قدرے توقف کے بعد پوچھا:

حجاج۔ اس موقع پر تیرے مسکرانے کا سبب کیا ہے؟

ام علقمہ نے تن کر کہا۔

"تیرے مصاحبوں نے تو تیرے دوست کے حاشیہ نشینوں کو بھی مات کر دیا ہے۔"

حجاج۔ (حیرت سے) کون دوست؟

ام علقمہ۔ (بدستور مسکراتے ہوئے) فرعون ـــ اس نے جب حضرت موسیٰ کے قتل کے بارے میں اپنے درباریوں اور مصاحبوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے بیک زبان ہو کر کہا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی کو چند روز کی مہلت دو مگر تمہارے مصاحب ان سے بھی بڑھے ہوئے ہیں کہ ایک بے گناہ عورت کے خون کو حلال قرار دے رہے ہیں۔

ام علقمہ کے اس دلیرانہ جواب اور فقید المثال جرأت نے حجاج کو پانی پانی

کر دیا۔ اس کا غیظ و غضب ندامت میں تبدیل ہو گیا اور اس نے فوراً تلوار نیام کر کے ام علقمہ کو رخصت کر دیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ظالم اور سفاک حجاج کی یوں بے نیام کی ہوئی تلوار ام علقمہ کا خون چاٹے بغیر واپس نیام میں چلی گئی۔ درحقیقت ایک بہادر اور شجاع خاتون نے بھرے دربار میں اسے ذلت آمیز شکست دی تھی اور ام علقمہ اس کے قصر جور و استبداد میں ایک خوفناک زلزلہ بن کر وارد ہوئی تھی۔ اس کی ایک مجاہدانہ مسکراہٹ اور مسکت جواب نے حجاج کے ظلم و ستم کو اپنے قدموں پر سجدہ ریز ہونے کے لئے مجبور کر دیا تھا ورنہ کسی پر رحم کھانا تو اس کی فطرت کے سراسر خلاف تھا۔

سوچئے! یہ کس تعلیم و تربیت کا کرشمہ تھا؟ ام علقمہ نے کون سے مدرسے اور کون سی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی؟ وہ بھی آپ کی طرح ایک عورت تھی ـــــ بالکل سادہ مزاج اور صاف گو عورت۔ آخر ام علقمہ اور آپ میں کس چیز کا فرق ہے؟ ام علقمہ میں وہ کون سی بات تھی جو آپ میں نہیں ہے؟ ان تمام سیدھے سادے سوالات کا جواب خود ہی سوچئے۔ کیا یہ درست نہیں کہ ام علقمہ اسلام کی تعلیم کا ایک معمولی سا پر تو تھی؟ اس کا دل نشۂ توحید سے سرشار تھا۔ وہ ایک سچی مسلمان عورت تھی جو دنیا میں اللہ کے سوا کسی سے بھی مرعوب ہونا، خوف کھانا اور ڈرنا نہ جانتی تھی۔ مسلمان تو ہم بھی ہیں۔ مگر ہم اسلام کی روح سے یکسر عاری ہو چکے ہیں۔ ام علقمہ کی زندگی اس حقیقت کا درس دیتی ہے کہ ایک حقیقی معنوں میں مسلمان عورت کا دل دنیا کی محبت کا اسیر نہیں ہوتا وہ موت کے خوف سے اسی طرح بیگانہ ہوتی ہے جس طرح ہم دین سے بیگانے ہو چکے ہیں۔ موت اس کے نزدیک ایک بے معنی لفظ ہوتا ہے۔ مسلمان عورت آگے بڑھ کر موت کا خیر مقدم کرتی ہے اور پھر ایسی موت جو حق و صداقت کی راہ میں نصیب ہو ـــــ یہی تو اس کی سب سے بڑی تمنا ہوتی ہے۔

تاریخ سے پوچھ لیجئے! یہی وہ مائیں تھیں جن کے آغوش سے تربیت پاکر نکلنے والوں نے قیصر و کسریٰ کی شوکت و حشمت کو خاک میں ملا دیا تھا ــــــ یہی وہ مائیں تھیں جنہوں نے اپنی نرم و نازک انگلیوں سے تاریخ کے بے شمار تابندہ و درخشندہ ابواب تحریر کئے جن پر آج بھی ہم فخر کر سکتے ہیں۔

حضرت سکینہ بنت امام حسین علیہ السلام

"میری چھوٹی بیٹی تو یادِ الٰہی اور معرفت خداوندی
میں اس طرح مستغرق رہتی ہے کہ شادی بیاہ
کی طرف اس کا بالکل کوئی رجحان معلوم نہیں ہوتا"
(سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام)

اُمّ الخیر حضرت رابعہ عدویہؒ

"میں نے اپنے کو مفلس اور رابعہ کو مخلص پایا۔"

(حسن بصریؒ)

"جب عورت راہِ خدا میں مرد اور بہادر ہو اس کو عورت نہیں کہنا چاہیئے۔"

(حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ)

"حضرت سفیان ثوریؒ مسائل دریافت کرنے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپ کی دعا اور نصیحت کے متمنی اور آرزو مند رہتے تھے۔

(داراشکوہ)

وہ چمن زار شرف و ولایت اور فخر و بزرگی جس کی مہک سے عبادت و تقوے کی دنیا ہمیشہ رشکِ فردوس بنی رہے گی۔

اُمّ الخیر حضرت رابعہؒ عدویہ

آپ عرب کے ایک مشہور خاندان قبیلہ عدوی سے تھیں۔ بصرہ میں پیدا ہونے کی وجہ سے رابعہ بصریہ کے نام سے مشہور ہوئیں۔ کنیت ام الخیر تھی۔ حضرت رابعہؒ کے والد اسماعیل انتہائی تنگ دستی اور عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ بے حد دین دار، عبادت گزار اور نیک نفس تھے مگر غریبی اور مفلسی کا یہ عالم تھا کہ جس رات حضرت رابعہؒ پیدا ہوئیں گھر میں چراغ جلانے کے لئے تیل تک موجود نہ تھا اور نہ انہیں لپیٹنے کے لئے فالتو کپڑا تھا۔ حضرت رابعہؒ کی تین بڑی بہنیں تھیں۔ اور آپ سب سے چھوٹی تھیں اسی لئے آپ کا نام رابعہ یعنی چوتھی لڑکی مشہور ہوا۔ حضرت رابعہؒ کے والد ماجد ان کی پیدائش کے وقت کسی ہمسائے سے تیل مانگنے کے لئے گئے مگر غیرت نے دستِ سوال دراز کرنا گوارا نہ کیا اور واپس آ گئے۔ اسی حالت میں سو گئے تو خواب میں بشارت ہوئی کہ بصرہ میں ایک شخص عیسٰی زادان ہے جو ہر شب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سو مرتبہ درود بھیجتا ہے۔ ایک رات وہ درود بھیجنا بھول گیا ہے اور اب کفارے کے طور پر وہ اپنی حلال کی کمائی سے چار سو دینار تمہارے پاس بھیجے گا چنانچہ صبح کو عیسٰی زادان چار سو دینار لے کر خود ان کے والد کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اشیائے ضرورت فراہم کیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جس رات حضرت رابعہؒ پیدا ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے والد کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا کہ تمہارے ہاں بہت مبارک لڑکی پیدا ہوئی ہے۔

حضرت رابعہؒ نے اسی قناعت اور فقر و تنہائی کے ماحول میں ابتدائی تربیت حاصل کی مگر جلد ہی والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور دوسری بہنیں بھی ان سے جدا ہو گئیں آپ کی عمر ابھی دس سال کی تھی کہ کسی نے انہیں لونڈی بنا کر بیچ ڈالا۔ خریدار آپ سے سخت مشقت اور محنت کے کام لیتا تھا۔ ایک معمولی کنیز ہونے کی وجہ سے آپ نے بے پناہ مصائب اور تکالیف برداشت کیں۔ ایک دفعہ آپ بازار میں کسی کام کی غرض سے جارہی تھیں کہ کسی نامحرم کو دیکھ کر راستہ چھوڑنے کی کوشش میں گر پڑیں اور آپ کا ایک ہاتھ ٹوٹ گیا۔ آپ نے سجدہ میں گر کر اللہ سے دعا مانگی کہ یا الہیٰ! اگرچہ میں ایک مصیبت زدہ معمولی کنیز اور بے حیثیت لونڈی ہوں لیکن مجھے اپنے مصائب و آلام کی کوئی فکر نہیں رہی صرف تیری رضا اور خوشنودی چاہتی ہوں۔

اس تکلیف دہ غلامی کے زمانے میں بھی آپ انتہائی زاہدانہ زندگی بسر کرتی تھیں اور ہر وقت یادِ الہیٰ میں مصروف رہتی تھیں۔ محنت و مشقت اور کام کاج کے بعد تمام وقت صوم و صلوٰۃ اور وظائف و دعا میں بسر کرتی تھیں ہمیشہ روزہ رکھتی تھیں اور رات رات بھر عبادت میں مصروف رہتی تھیں۔ ایک رات آپ اپنے مالک حقیقی کے حضور سربسجود ہو کر دعا و استغفار میں محو تھیں کہ اتفاق سے گھر کا مالک جاگ اٹھا اس نے دیکھا کہ مکان میں ہر طرف اندھیرا ہے مگر حضرت رابعہؒ کے کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے قریب آکر دیکھا کہ حضرت رابعہ سجدے میں گری ہوئی ہیں اور ان کے سر کے قریب ایک نورانی ہنڈولا سا لٹک رہا ہے جس کی روح پرور روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے غور سے کان لگا کر سنا تو حضرت رابعہ یہ کہتی ہوئی سنائی دیں۔

"خداوندا! میں تیری مخلوق ہوں۔ لیکن تیری رضا اس میں تھی کہ میں تیرے ہی ایک بندے کی خریدی ہوئی لونڈی بن کر رہوں۔ اگر میں تیرے سوا

کسی اور کی کنیز نہ ہوتی تو تیری عبادت کے لئے اتنی دیر میں حاضر نہ ہوتی اور ایک لمحہ بھی تیری عبادت سے غفلت نہ کرتی۔

حضرت رابعہ کا مالک یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر سخت حیران ہُوا اور اس پر اس قدر رقت طاری ہوتی کہ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ ایک معمولی کنیز کا روحانی مرتبہ اتنا بلند بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے فوراً صدق دل سے توبہ کی کہ آئندہ کبھی ایسی نیک اور خدا رسیدہ خاتون سے کوئی خدمت نہیں لوں گا۔
صبح ہوتے ہی اس نے حضرت رابعہؒ کو آزاد کر دیا اور بڑے ادب کے ساتھ عرض کی کہ اگر آپ چاہیں تو یہاں قیام فرمائیں۔ میں آپ کی ہر ممکن خدمت کو اپنے لئے باعثِ فخر و سعادت خیال کروں گا۔ بصورتِ دیگر آپ جہاں پسند فرمائیں تشریف لے جائیں۔ آپ نے آزاد ہوتے ہی شہر کے ایک غریب محلے میں ایک معمولی سا مکان لے کر رہنا شروع کیا اور اپنی باقی زندگی یادِ الٰہی کے لئے وقف کر دی۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ آپ نے کسی شخص کے ساتھ شادی کر لی تھی اور اس کی وفات تک عام لوگوں کو آپ کی بزرگی اور عظمت کا زیادہ علم نہ ہو سکا کیونکہ وہ دنیا کے ہنگاموں سے الگ تھلگ خاموشی کے ساتھ اللہ کی یاد میں مصروف رہتی تھیں۔ جب آپ کے شوہر کا انتقال ہُوا اس وقت ان کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ مشہور و معروف بزرگ حضرت حسن بصریؒ آپ کے استاد تھے۔ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دینی امور کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ خود حضرت حسن بصریؒ ان کے بہت زیادہ مدّاح تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے کو مفلس اور رابعہ کو مخلص پایا ہے۔
آپ کی مبارک زندگی سادگی، تقوےٰ، طہارت، پاکیزگی اور دینداری کا ایک بے مثال نمونہ تھی۔ انہوں نے جن تکلیف دہ اور پُر مصائب حالات میں روحانی کمال و ترقی کی منازل طے کیں وہ ایک عجوبہ سے کم نہیں۔ زہد و عبادت کا یہ عالم تھا کہ

آپ رات رات بھر عبادت کرتی تھیں۔ ہمیشہ روزہ رکھتی تھیں اور رات دن میں ایک ہزار نوافل ادا کرتی تھیں۔ شب بیداری اور یادِ الٰہی میں مستغرق رہنا فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ آپ کو شہرت، ناموری اور خوشامد سے سخت نفرت تھی۔ اس لئے ہمیشہ اپنے نیک اعمال اور روحانی بلندیوں کو دوسروں سے چھپایا کرتی تھیں اور لوگوں کو بھی نصیحت کیا کرتی تھیں کہ جس طرح تم اپنے عیوب اور گناہ دوسروں سے چھپاتے ہو، اسی طرح اپنی نیکیوں اور اچھے کاموں کو بھی پوشیدہ رکھا کرو۔ اگر کوئی شخص ان کی تعریف کرتا تو انہیں سخت روحانی اذیت ہوتی تھی۔ ایسے لوگوں کو حضرت رابعہؒ یہ کہہ کر ٹال دیتی تھیں کہ جاؤ کوئی نیک کام کرو، کیوں اپنا وقت بے کار ضائع کرتے ہو۔ آخر عمر میں تو ان کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ کسی سے بات چیت کرنا پسند نہ کرتی تھیں اگر کسی اشد ضروری بات کا جواب دینا پڑتا تو آیاتِ قرآنی سے جواب دیا کرتی تھیں۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہیں قرآن کریم پر کتنا عبور حاصل تھا۔

آپ کے شرف و تقدس کا یہ عالم تھا کہ حضرت سفیان ثوریؒ ایسے جلیل القدر بزرگ مسائل دریافت کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور دعا و نصیحت کے آرزومند رہتے تھے۔

ایک دفعہ کسی نے آپ سے دریافت کیا آپ اللہ کو دوست رکھتی ہیں۔ فرمایا بے شک میں اللہ کو دوست رکھتی ہوں۔ سوال کرنے والے نے پھر پوچھا کہ کیا آپ شیطان کو دشمن سمجھتی ہیں؟ فرمایا کہ اللہ کی محبت نے مجھے اس درجہ وارفتہ بنا رکھا ہے کہ مجھے شیطان کی دشمنی کی نہ پروا ہے اور نہ اتنی فرصت کہ میں اس طرف توجہ دوں۔

اس شرف و امتیاز کی وجہ سے آپ عوام میں تاج الرجال کے لقب سے مشہور تھیں اور آپ کا آستانہ مبارک بڑے بڑے بلند مرتبہ بزرگوں کے لئے سرچشمہ عرفان و ہدایت کی حیثیت رکھتا تھا۔

بندوں کا احسان لینے سے ہمیشہ بچتی تھیں کیونکہ وہ بے حد خود دار اور غیرت مند تھیں۔ ایک دفعہ موسم بہار میں گھر میں داخل ہوئیں پھر باہر نہ نکلیں۔ کسی نے آپ سے کہا کہ باہر آؤ اور اللہ کی قدرت کا مشاہدہ کرو۔ فرمایا کہ تم اندر آ کر صانع قدرت کا جلوہ دیکھو۔ وہ شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ کے کپڑے بہت بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ اس نے عرض کیا کہ ہر شخص آپ کی خدمت کرنا اپنے لیئے باعثِ سعادت خیال کرتا ہے۔ اشارہ فرمائیں تو نیا لباس حاضر کر دیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس مالک ارض و سماء سے دنیا طلب کرتے ہوئے شرم آتی ہے جو ہر چیز کا مالک ہے۔ بھلا اس سے کیونکر طلب کر سکتی ہوں جو خود مالک حقیقی کا محتاج ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپ فریضۂ حج ادا کرنے کے لیئے جا رہی تھیں۔ راستے میں آپ کا گدھا بیمار ہو گیا۔ اور لوگوں نے خیال کیا کہ مر گیا ہے چنانچہ اہل قافلہ میں سے ہر شخص نے آپ کا سامان اٹھانے کے لیئے پیشکش کی۔ آپ نے شکریہ کے ساتھ انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ جب میں نے حج کا ارادہ کیا تھا تو مجھے اللہ کی مدد پر بھروسہ تھا۔ میں اس کے بندوں کی مدد پر بھروسہ کر کے نہیں آئی۔ جب قافلے والے آپ سے علیحدہ ہو گئے تو آپ نے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ دعا کی اے مالک! ایک غریب اور مسکین عورت کے ساتھ شہنشاہ کو ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ تو نے مجھے اپنے گھر میں آنے کی دعوت دی اور میرے گدھے کو راستے میں ہی قریب المرگ کر دیا۔ تجھے علم ہے کہ میں تیرے احسان کی عادی ہوں۔ مجھے اپنے بندوں کے احسان سے بچا۔ دوسرے دن آپ کا گدھا بالکل تندرست ہو گیا۔ آپ ہمیشہ اللہ سے دعا کیا کرتی تھیں کہ اے خدا دنیا سے جو کچھ میرے نصیب میں تو نے لکھا ہے وہ اپنے دشمنوں کو عطا فرما۔ کیونکہ میرے لیئے بس تیری ذات پاک کافی ہے مجھے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تذکرہ نویسوں نے کشف و کرامات کے بے شمار واقعات آپ سے منسوب کیئے ہیں۔

ان معجزات وکرامات کی روایات میں آپ کی زندگی کے حالات بھی گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ نے آپ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ عورت راہِ خدا میں مرد اور بہادر ہو اس کو عورت نہیں کہنا چاہیئے۔ حضرت عطارؒ نے ایک معمولی سا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ایک دفعہ نو بھوکے آدمیوں نے آپ سے کھانے کا سوال کیا۔ آپ کے پاس صرف دو روٹیاں تھیں۔ اتنے میں کسی نے آواز دی۔ آپ نے دونوں روٹیاں اسے عنایت فرما دیں۔ بھوکے مہمان سخت حیران ہوئے کہ اب ہمیں کیا دیں گی؟ اتنے میں کسی کی کنیز بہت سی روٹیاں لے کر آ گئی۔ آپ نے گنا تو اٹھارہ روٹیاں تھیں۔ کنیز سے فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ تو غلطی سے یہ روٹیاں لے کر میرے پاس آ گئی ہے۔ تیری مالکہ نے کہیں اور بھیجا ہوگا۔ کنیز نے بہت کہا کہ مالکہ نے یہ روٹیاں آپ کی خدمت میں پیش کی ہیں۔ مگر آپ نے اسے واپس لے جانے کی ہدایت کی۔ اس پر بھوکے مہمان اور بھی بہت پریشان ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد وہی کنیز پھر روٹیاں لے کر واپس آئی۔ گنا تو پوری بیس روٹیاں تھیں۔ آپ نے یہ روٹیاں اپنے مہمانوں کے سامنے رکھ دیں۔

انہوں نے حیرت کے ساتھ روٹیاں واپس کرنے کی وجہ پوچھی تو حضرت رابعہؒ نے فرمایا کہ جب تم لوگ میرے ہاں آئے تھے تو مجھے معلوم تھا کہ تمہیں کئی دنوں کا فاقہ ہے۔ میں نے سوچا کہ میرے پاس تو صرف دو روٹیاں ہیں یہ تو مہمانوں کے لئے بالکل ناکافی ہیں۔ اس لئے میں نے سائل کو دے دیں اور اللہ سے دعا کی کہ تو نے اسی دنیا میں ایک کے بدلے دس دینے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ وعدہ پورا کر دے۔ یہی وجہ تھی کہ جب اٹھارہ روٹیاں آئیں تو میں سمجھ گئی کہ یا تو لونڈی نے بددیانتی کی ہے یا بھیجنے والی نے غلطی کی ہے۔ چنانچہ میں نے تمہارے سامنے روٹیاں واپس کر دیں اور دوبارہ پوری بیس روٹیاں آ گئیں۔

اکثر مغربی اور مشرقی مورخین نے حضرت رابعہؒ کا یہ مشہور خواب بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ آپ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے رابعہ! تو مجھے دوست رکھتی ہے! عرض کیا یا رسول اللہ! کون ہے جو آپ کو دوست نہیں رکھتا۔

ایک اور واقعہ بھی مشہور ہے کہ ایک دفعہ حج کرنے گئیں تو سات برس تک عرفات میں مقیم رہیں۔ حضرت شیخ علیؒ کا بیان ہے کہ انہیں غیب سے یہ آواز سنائی دی کہ اے رابعہ! تیری یہ کیسی طلب ہے جس نے تیرا دامن پکڑ لیا ہے۔ اگر تجھے میری تمنا ہے تو خواہش کر کہ میں تجلی کر دوں۔ حضرت رابعہ نے عرض کی کہ اے خالقِ کائنات! غریب اور کمزور رابعہ میں اتنی قوت کہاں کہ تیری تجلی دیکھ سکے۔ میں صرف ایک نکتے کی حقیقت معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ فقر کیا شے ہے۔ جواب ملا کہ فقر ہمارا قہر ہے ـــ

اللہ اللہ! ان ہستیوں کی عظمت و رفعت کا بیان کہاں ممکن ہے۔ جن کے خوابوں کی دنیا رحمتِ دو عالم، شہنشاہِ کونین، احمدِ مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوے سے آباد ہو اور جو عرفانِ حقیقت کی اس آخری منزل تک پہنچ چکی ہوں۔ جہاں ذہن و نظر کے پردے اٹھ جائیں، وجودِ خاکی کے حجاب ختم ہو جائیں اور عالمِ انوار کے لافانی مناظر بے نقاب ہو کر سامنے آ جائیں۔ ایک دفعہ کسی نے از راہ تمسخر ان سے کہا کہ مردوں کو تین رتبے ایسے عطا ہوئے ہیں جن سے عورتیں محروم ہیں۔ مرد کامل العقل اور مضبوط ہوتے ہیں مگر عورتیں ناقص اور کمزور چنانچہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر رکھی گئی ہے۔ عورتیں دین کے معاملے میں ناقص ہوتی ہیں۔ تیسرے کسی عورت کو آج تک نبوت عطا نہیں ہوئی۔ حضرت رابعہؒ نے فرمایا کہ عورتوں کو تین فضیلتیں ایسی عطا ہوئی ہیں کہ جن سے مرد محروم ہیں۔ کسی عورت نے آج تک خدائی کا باطل دعویٰ نہیں کیا۔ عورتوں میں ہیجڑے نہیں ہوتے۔ آج تک جتنے نبی، ولی، شہید، صدیق، علماء

اور فضلا ہوئے ہیں سب عورتوں کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ لوگوں نے حضرت رابعہ سے دریافت کیا کہ بندہ کس طرح خوش ہو سکتا ہے؟ فرمایا کہ جب محنت اور نعمت دونوں پر یکساں اللہ کا شکر کرے۔ پھر پوچھا گیا کہ کیا گناہگار کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ گناہگار تو توبہ ہی اسی وقت کرے گا جب اللہ اسے توبہ کرنے کی توفیق دے گا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ انسان آنکھوں، کانوں اور زبان سے معرفت الٰہی کی منزل نہیں پا سکتا کیونکہ یہ سب اعضا تو حیرت کے سوا کچھ نہیں، اس کا انحصار صرف دل پر ہے۔ اپنے دلوں کو بیدار رکھنے کی کوشش کرو کیونکہ دل اگر بیدار ہے تو خود بخود اللہ کی محبت میں گم ہو جاتا ہے۔

جب وقت وفات قریب آیا تو اپنی خدمت گزار عبدہ بنت شوال سے کہا اے عبدہ! میری موت کے بعد میرے لئے کسی کو تکلیف نہ دینا۔ اس وقت میں جو کرتا پہنے ہوئے ہوں اسی میں دفن کر دینا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ وفات کے وقت کئی بزرگ ہستیاں اور اولیائے وقت آپ کے سر بالین موجود تھے۔ آپ نے فرمایا کہ یہاں سے اٹھو اور اللہ کے محبوب بندوں کے لئے جگہ خالی کر دو۔ سب اٹھ کر باہر چلے گئے تو اندر سے یہ آواز سنی گئی "اے نفس مطمئنہ! تو میری رحمت پا کر شاکر رہا محنت و مشقت پر صابر رہا۔ دنیا سے اپنے پروردگار کی طرف رخصت ہو۔ اس حال میں کہ خدا کی عطا و بخشش پر تو راضی ہے اور خدا تجھ سے راضی ہے۔ میرے برگزیدہ اور صالح بندوں کے گروہ میں شامل ہو جا۔" جب یہ اکابر مشائخ اندر گئے تو حضرت رابعہؒ عالم جاودانی کی طرف رخصت ہو چکی تھیں۔ مزار جبل قدس میں بیان کیا جاتا ہے۔

وفات کے بعد آپ کو کسی نے خواب میں دیکھا اور ان سے پوچھا کہ نکیرین کے ساتھ کیسا معاملہ ہوا فرمایا جب وہ آئے اور پوچھا کہ تیرا رب کون ہے تو میں نے ان سے کہا کہ واپس جاؤ اور حق تعالیٰ سے کہو کہ اتنی بے اندازہ مخلوق ملی تو تنے اس کمزور سی

اور نحیف و نزار بوڑھی عورت کو نہیں بھلایا تو میں تجھے کیسے فراموش کر سکتی ہوں جب کہ تو مجھے ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔

حضرت رابعہ بصری کی زندگی اور ان کے کردار کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسی دور کے عام حالات کو اپنے سامنے رکھیں۔ بنو امیہ کا دورِ حکومت تھا۔ امراء دولت، اقتدار اور حکومت کے نشے میں مست تھے۔ عام لوگ زندگی کو پرآسائش اور مسرت انگیز بنانے کے لئے ہر وقت زر و مناصب کے حصول کے لئے جدوجہد میں مصروف رہتے تھے۔ دنیا پرستی کی ہوس بلند اور اعلےٰ اوصاف کو دیمک بن کر چاٹ رہی تھی۔ اسلام کی پاکیزہ تعلیم کے حقیقی خدوخال زر اندوزی اور ہوس پرستی کے بے پناہ بوجھ تلے دبے جا رہے تھے۔ ایسے وقت میں اللہ تعالےٰ نے ایک مردِ درویش حضرت حسن بصریؒ اور ایک بلند مرتبہ خاتون حضرت رابعہ بصریؒ کو یہ توفیق عطا فرمائی کہ وہ فکر و نظر کی گہری تاریکی میں نیکی اور معرفتِ الٰہی کے چراغ روشن کریں۔ تاریخ گواہ ہے کہ بصرہ کے تنگ و تاریک محلوں اور بوسیدہ جھونپڑوں میں روشن ہونے والی ان دو مشعلوں نے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عرفان و ہدایت کے لاکھوں چراغ روشن کر دیئے۔ دنیا کے تاریک ترین گوشے بھی ان کے نورانی کردار کی قندیلوں سے جگمگا اٹھے۔ ان دو مبارک ہستیوں نے جس سلسلۂ رشد و ہدایت کی بنیاد رکھی تھی اس نے پھیل کر پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اولیائے کرام کی بے پناہ ہمت اور مسلسل کوششوں سے دور دراز ممالک میں حیرت انگیز سرعت سے اسلام پھیلتا چلا گیا۔ خصوصیت کے ساتھ برِصغیر پاک و ہند اور قرب و جوار کے جزائر میں آج ہمیں جو مسلمان نظر آ رہے ہیں وہ سب ان اولیائے کرام کی تبلیغی کوششوں کے رہینِ منت ہیں۔

حضرت رابعہ بصریؒ نے اس منصب پرستی اور زر اندوزی کے دور میں غیرت

اور خودداری کی جو مثال قائم کی وہ اسلام کی عظمت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ آپ نے عمر بھر کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ اپنی حاجت روائی کے لئے کسی بادشاہ اور رئیس کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا تادمِ آخر کسی کا احسان تک لینا گوارا نہ کیا اور دنیا کی کوئی مجبوری ان کے پاؤں کی زنجیر نہ بن سکی۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے رازق پر بھروسہ کیا، ہمیشہ خالق ارض و سما سے مدد مانگی اور اسی شہنشاہوں کے شہنشاہ کے دربار میں جھولی پھیلا کر اپنی مراد مانگی —— وہاں بھی انہوں نے کبھی دنیا طلب نہیں کی۔ دولت نہیں مانگی، حشمت و شوکت کی تمنا نہیں کی، جاہ و جلال کی آرزو نہیں کی۔ دنیوی عیش و آرام کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ جب بھی دستِ طلب دراز ہوا تو اسی دعا کے ساتھ کہ الٰہی! بس تیری رضا اور خوشی چاہتی ہوں۔ تیرے سامنے سب کچھ ہیچ ہے۔ مجھے تیرے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بے نیازی اور فقر و غناء کا یہ عالم تھا کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھی دنیا کے کسی شخص کا احسانمند ہونا گوارا نہیں کیا۔ بلکہ یہ وصیت فرمائی کہ جو بوسیدہ کرتا زیب بدن ہے اسی کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ ہماری ان بہنوں کے لئے مقام غور ہے جن کی نگاہ اس چند روزہ زندگی کی بے حقیقت اغراض سے کبھی آگے نہیں بڑھتی۔ پر تکلف ملبوسات، گراں قدر زیورات، پر تکلف کھانے اور زندگی کی آسائشیں جن کے لئے حاصل کائنات ہیں۔ جنہیں اپنے اعمال و افعال کی وجہ سے معمولی سی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ آسمان سر پہ اٹھا لیتی ہیں۔ اپنے ساتھ کئی دوسرے لوگوں کو وقفِ رنج و الم بنا دیتی ہیں۔ دوسری طرف وہ مبارک ہستی ہے کہ عسرت و افلاس اور تنگدستی کے ماحول میں ہوش سنبھالا تو ماں باپ کی شفقت سے محروم ہو گئیں۔ اسی پر مصائب کا خاتمہ نہیں ہو گیا۔ بصرہ کے بازار میں انہیں کنیز بنا کر فروخت کیا گیا۔ بے پناہ محنت اور مشقت کے عذاب میں مبتلا کیا گیا۔ مگر وہ جوہر قابل مصائب و آلام کی اس بھٹی میں رہ کر کندن بنتا چلا گیا۔ انہوں نے

ان حالات میں بھی ہمیشہ صبر و رضا اور توکل کا چراغ روشن رکھا۔ کبھی شکایت نہیں کی۔ کبھی حالات کا رونا نہیں رویا۔ کبھی اپنے مولا سے شکوہ نہیں کیا۔ ہمیشہ خندہ پیشانی اور صبر و استقلال سے ہر مصیبت کا خیر مقدم کیا اور اللہ کا شکر ادا کیا، زہد و عبادت کی طرف توجہ فرمائی تو فرشتوں کو شرمسار کر دیا۔ آہ سحرگاہی سے با وضو رہ کر اپنی خاموش راتوں کو ہمیشہ سجدوں سے آباد رکھا۔ تقوےٰ و طہارت میں بڑے بڑے اللہ والوں اور خدا رسیدہ بزرگوں کو مات کر دیا۔ عشق الٰہی اور استغراق میں وہ کمال حاصل کیا کہ دنیا آج تک حیران ہے کہ ایک عورت کیسے درجۂ ولایت تک جا پہنچی اور کوئی مرد آج تک ان کا مقابلہ نہ کر سکا۔ سلوک و معرفت کی تمام منازل ایک سچی مسلمان خاتون کی طرح اس طرح طے کیں کہ کسی قدم پر احکامِ دین کی تعمیل میں غفلت نہیں ہوئی آخر یہ مرتبہ نصیب ہوا کہ رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی اور میدانِ عرفات میں قریب تھا کہ تمام حجاب اٹھ جاتے اور کوہِ طور کو لرزہ براندام کر دینے والی تجلی ان کے سامنے ہوتی اور روایت کلیمی کو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربار کی ایک معمولی کنیز میدانِ عرفات میں دہرا کر مذہبی تاریخ کا رخ بدل دیتی مگر مشیت کو یہ منظور نہ تھا اور حضرت رابعہؒ شاید اس کی متحمل بھی نہ ہو سکتی تھیں۔ ایسا نہ ہوا مگر ایک خدا رسیدہ خاتون نے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ حضرت خیر الانام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن تھام کر انسانی وجود کی سرحدوں سے بہت آگے تک بھی جا سکتی ہے۔ کون کہتا ہے کہ عورت ناپاک اور نجس ہوتی ہے کون اس حقیقت کو جھٹلا سکتا ہے کہ ایک بلند مرتبہ خاتون کی عظمت حضرت حسن بصریؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ ایسے بزرگوں سے خراج عقیدت حاصل کر سکتی ہے اور بڑے بڑے علماء اور مشائخ اس کے سامنے زانوئے تلمذ طے کر سکتے ہیں۔ ایک رابعہ بصریؒ ان کروڑوں مردوں پر بھاری ہیں جو اپنے نفس کے قید خانے سے باہر نہیں آ سکتے۔

ہماری وہ بہنیں جو آج چند کتابیں پڑھ کر پوری دنیا کو ہیچ سمجھنے لگتی ہیں۔

اس سرچشمۂ علم وعرفان کی طرف دیکھیں کہ علم ان کی چوکھٹ پر سجدہ ریز تھا۔ مشکل ترین مسائل اور حقائق کائنات پر انہیں حیرت انگیز عبور تھا۔ قرآن ان کی گفتگو تھی یعنی وہ آیاتِ قرآنی میں بات کرتی تھیں، علوم عصریہ ان کے سامنے بے حقیقت تھے مگر اس کے باوجود وہ نیکی و پارسائی، تقوےٰ و طہارت، عفو و حلم، مروّت و شفقت خاکساری اور عجز کا مجسمہ تھیں۔ حضرت رابعہ بصریؒ کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے معرفتِ الٰہی، عشقِ حقیقی اور سلوک کی تمام منزلیں طے کیں۔ مگر احکام خداوندی اور شریعت سے کبھی سرِ مو انحراف نہیں فرمایا بلکہ ہمیشہ روزہ و نماز اور زہد و عبادت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ حالانکہ عشقِ الٰہی اپنے جلال و جمال کے ساتھ ان کے وجود کا حصّہ بن چکا تھا۔ کس قدر عالی ظرف تھیں حضرت رابعہ بصری۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ کسی کو اجازت دی کہ کوئی ان کی خوشامد تو کیا تعریف بھی کر سکے۔ کیونکہ ان کے نزدیک دوسروں کی خوشامد سے انسان ذلیل ہوتا ہے اور کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوتا ہے اور دوسروں کی خوشامد سے کبر و غرور کی بیماری پیدا ہوتی ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک مسلمان کے لئے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سلام اس ہستی پر جس نے دنیادار لوگوں سے بے نیاز رہ کر حقیقی خودداری کی اسلامی روایات کو زندہ کیا۔ رشد و ہدایت اور علم و معرفت کے چراغ روشن کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام صرف شمشیر زنی، جہانبانی، جہانگیری، فتوحات اور پرشکوہ سلطنتوں کا نام نہیں بلکہ یہ تسخیرِ قلوب کے ایک ایسے عمل کا نام ہے جس کی طاقت کا مخزن بھی دل کے اندر ہوتا ہے۔ یہ وہ رشتہ ہے جو بندوں کا تعلق ان کے خالق سے پیدا کرتا ہے۔ یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ حضرت رابعہؒ بصری ایسے بزرگوں نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر، لشکر و سپاہ اور شمشیر و سلطنت

سے بے نیاز رہ کر کفر و ظلمت کے ان مراکز میں توحید الٰہی کے دیئے جلائے۔ جہاں اسلام کا نام لینے والوں کی گردنیں اڑا دی جاتی تھیں۔ ان بوریا نشین فقیروں نے فقر و استغناء کی طاقت سے جاہ و جلال اور حشمت و شوکت کو ہر جگہ شکست فاش دی۔ شہنشاہوں اور مہاراجوں کی ہیبت و صولت کو لرزہ براندام کر دیا۔ تاریخ سے پوچھئے کہ کس طرح شکوہ بوریا سے سریر قیصری کانپتا رہا ہے۔ اسی فقر و استغناء میں مسلمانوں کا حقیقی جوہر پنہاں ہوتا ہے۔

حضرت رابعہ بصریؒ کی زندگی جہاں ہمیں غیرت، خودداری اور غیر اللہ کی چوکھٹ پر نہ جھکنے کا درس دیتی ہے وہاں یہ سبق بھی سکھاتی ہے کہ جب مسلمان دنیا کی ہر بڑی سے بڑی طاقت سے بھی ڈرنا چھوڑ دیتا ہے اور صرف اللہ سے ڈرنا سیکھ لیتا ہے تو پھر دنیا کی ہر بدی اور ہر شیطانی طاقت اس سے ڈرتی ہے۔ دنیا کی محبت سے بے نیاز رہنے والے کو دنیا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

خدا کرے کہ حضرت رابعہ بصریؒ کے شعلۂ حیات کی ایک چنگاری ہماری ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے مردہ قلوب میں بھی جوشِ کردار کا یہ جوہر پیدا کر دے اور ہم ان کی ماہتاب کی طرح روشن زندگی سے کم از کم یہ سبق ضرور سیکھ سکیں کہ اپنی حاجت روائی کے لئے اللہ کے سوا کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کریں۔

باب دوم

عائشہ بنت طلحہؓ

آپ علوم و فنون کا ایک مرقع جمیل تھیں
اور عرب بھر میں صاحبِ فضل و کمال خیال
کی جاتی تھیں۔ دورِ اموی کی اکثر علم دوست
اور ممتاز خواتین میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

عائشہ بنت طلحہؓ

باپ کا نام طلحہؓ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشہور صحابی تھے
آپ کی والدہ ام کلثومؓ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی لختِ جگر تھیں یعنی حضرت
ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نواسی تھیں۔ بے حد حسین وجمیل اور ذہین و عقل مند تھیں۔
پہلا نکاح عبداللہ بن عبدالرحمان بن ابوبکرؓ سے ہوا۔ ان کی وفات کے بعد
حضرت عمر بن عبید اللہ کے نکاح میں آئیں۔ ان کے ہاں چار بیٹے عمران،
عبدالرحمان، ابوبکر اور طلحہ ہوئے اور ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام نفیسہ تھا۔ عائشہ
بنت طلحہ بھی مسلمانوں کے دورِ عشرت کی اسلام دشمن افسانہ طرازیوں سے محفوظ
نہ رہ سکیں۔ ان کی علمی فضیلت، ادبی قابلیت اور امتیازی حیثیت کو دشمنوں نے
مبالغہ آرائی اور ہرزہ سرائی کے ایسے رنگ دیئے ہیں کہ ان کی شخصیت بے سروپا
روایات اور من گھڑت قصوں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک بدنام اور اخلاق باختہ
قصہ نویس نے تو ان سے کئی ایک ایسی باتیں بھی منسوب کر دی ہیں جنہیں کوئی شریف النفس
شخص پڑھنا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ ہمارا اشارہ اسی افترا طراز اور دروغ باف ابوالفرج
اصفہانی کی طرف ہے جس نے حضرت سکینہ بنت حسینؓ ایسی بلند ہستی پر بھی بہتان
باندھنے میں شرم محسوس نہیں کی۔ اسی نے عائشہ بنت طلحہؓ کے متعلق بھی کئی ناروا باتیں
لکھی ہیں اور جھوٹ سچ کو اس طرح گڈمڈ کر دیا ہے کہ آج انتہائی تحقیق و جستجو کے
بعد بھی ان کے تفصیلی حالات نہیں مل رہے۔ ان کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو

سکتا ہے کہ آپ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ایسی باکمال اور بلند سیرت ہستی کے زیر سایہ تربیت حاصل کی۔ اپنی پیکر علم و فضل خالہ کی صحبت نے ان کے علمی اور ادبی ذوق کو نکھارنے میں بہت مدد دی۔ اور وہ بلند اوصاف کی ایک حسین و جمیل تصویر بن کر عہد شباب کو پہنچیں تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اپنے بھتیجے عبداللہ بن عبدالرحمان سے ان کی شادی کر دی مگر وہ کچھ عرصہ بعد انتقال کر گئے۔ جس خاتون نے بچپن سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے دامانِ عاطفت میں پرورش پائی ہو اس کے فضل و کمال اور اوصافِ جمیلہ کا اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں علم و فضل اور شعر و ادب میں انہیں جو امتیاز حاصل ہوا وہ اسی تربیت کا فیض اور اپنی خالہ کی صحبت کا اثر تھا۔ اصفہانی نے ان کے متعلق اغانی میں جھوٹ کا جو طومار باندھا ہے اس کا اندازہ اسی ایک بات سے ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے قول کے مطابق عائشہ بنت طلحہؓ نے عبداللہ بن عبدالرحمان کی وفات کے بعد مصعب بن زبیر سے دوسری شادی کی جو ان کے خالہ زاد بھائی تھے۔ اس شادی کا قصہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ مصعب نے ایک عورت عزۃ المیلا کو عائشہؓ کے پاس بھیجا کہ وہ ان کے حالات معلوم کر کے آگاہ کرے۔ دوسری طرف وہ بہتان لگاتا ہے کہ عائشہ پردہ نہ کرتی تھیں اور سب کے سامنے آجاتی تھیں۔ اگر اس کا یہ الزام درست ہوتا تو ان کے خالہ زاد بھائی کو ہرگز یہ ضرورت نہ پیش آتی کہ شکل و صورت دیکھنے اور حالات معلوم کرنے کے لئے وہ کسی دوسری عورت کی خدمات حاصل کرتے۔ جھوٹ سچ کی اس ملی جلی آمیزش سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں لڑکیاں اپنے خالہ زاد بھائیوں سے بھی سخت پردہ کرتی تھیں۔ وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ مصعب بن زبیرؓ نے عائشہ کے پہلے شوہر عبداللہ کی وفات کے بعد انہیں نکاح کا پیغام دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوہ ہو جانے کے بعد مصعب اپنی خالہ زاد بہن کی

شکل وصورت اور عادات وخصائل سے پوری طرح آگاہ نہ تھے اسی وجہ سے مصعب کو عزۃ المیلا کا احسان مند ہونا پڑا۔ خود اصفہانی کی اپنی روایات یہ ثابت کرتی ہیں کہ عائشہ نہایت نیک نفس، پاکباز اور صحیح معنوں میں مسلمان خاتون تھیں۔ وہ عفت وعصمت اور شرم وحیا کا پیکر تھیں۔ اور پردہ کی اس حد تک پابند تھیں کہ ان کے حقیقی خالہ زاد بھائی بیوگی کے بعد بھی ان کی شکل وصورت سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ جو نیک عورت اپنے اتنے قریبی رشتہ داروں سے بھی اتنی دور رہنے کی عادی تھیں، ان سے متعلق یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ عمر بن ربیعہ ایسا آوارہ شاعر جس سے شرفاء پناہ مانگتے تھے اتنی جرأت کر سکتا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نواسی اور طلحہؓ کی بیٹی سے متعلق توہین آمیز اشعار لکھے اور ان کے حسن وجمال کی تشہیر سوقیانہ انداز میں کرے۔ حیرت ہے کہ مصعب تو انہیں دیکھ نہ سکے مگر ایک شاعر نے انہیں اتنا قریب سے دیکھ لیا کہ وہ ان کے پیکر کو اشعار میں ڈھال کر کوچہ و بازار میں پڑھتا پھرے۔ کیا اس وقت طلحہؓ ایسے بلند مرتبہ صحابی کے خاندان میں ایک بھی غیرت مند شخص باقی نہ رہا تھا اور ان سب کا تعلق اسلام سے اتنی جلدی منقطع ہو گیا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے دورِ جاہلیت اپنی تمام ہوسناکیوں اور جہالت آمیزی کے ساتھ پھر سے زندہ ہو گیا اور وہ اپنے گھرانے کو بھی اس لعنت سے نہ بچا سکے۔

اسی طرح اصفہانی نے یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ مصعب سے شادی کے بعد عائشہ ہمیشہ ناراض اور رنجیدہ رہتی تھیں اور اپنے خاوند کی توہین کرتی تھیں۔ دوسرے ہی سانس میں وہ مصعب سے ان کی دلچسپی اور شوہر نوازی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ مصعب کسی بڑی لڑائی میں حصہ لینے کی وجہ سے کافی دیر تک گھر سے دور رہے۔ جب لڑائی ختم ہو گئی تو خاک آلود پیشانی لئے ہوئے ان سے ملنے آئے۔ عائشہ نے اپنے رومال سے ان کی پیشانی صاف کی۔ مصعب نے

کہا کہ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ لوہے اور پسینے سے ملی ہوئی بو تم تک پہنچے تو عائشہؓ نے جواب دیا کہ میرے لیئے یہ بو مشک سے بہتر ہے۔ اس روایت سے عائشہؓ کے ایک اور وصف کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہیں اپنے شوہر سے کتنی محبت تھی اور وہ ان سے کس پرخلوص محبت سے پیش آتی تھیں۔ عائشہ کے یہ الفاظ کہ میرے لیئے یہ بو مشک سے بہتر ہے اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں کہ ان کے دل میں اپنے شوہر کی اتنی عزت تھی اور وہ کتنی خدمت گزار تھیں۔ اغانی کی روایت کے مطابق عائشہ نے تیسرا نکاح عمر بن عبید اللہ سے کیا اور اسے بھی بدسلوکی کی شکایت رہتی تھی۔ واقعات و شواہد سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اغانی کے یہ تمام افسانے سراسر جھوٹ اور کذب بیانی پر مشتمل ہیں۔ اس کے اپنے بیانات میں جگہ جگہ صداقت جھانک رہی ہے درحقیقت اس قسم کے بے بنیاد قصے اس دور کی یادگار ہیں جب عیش پرست حکمرانوں اور عشرت نواز امرائے دربار کے خوشامدی شعراء، گویے اور قصہ گو ہر وقت اس کوشش میں مصروف رہتے تھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے آقاؤں کی عیش پرستی اور لہو ولعب کے لیئے کوئی نہ کوئی جواز پیدا کر کے انہیں خوش کر سکیں۔ شاہی دسترخوان کے ان گداگروں نے ان کے عیش وطرب کی محفلوں اور مجالس رقص و سرود کو جائز ثابت کرنے کے لیئے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ اور ان اندھوں کو اندھیرے میں ہر روز کوئی نہ کوئی نئی بات سوجھتی تھی۔ حضرت سکینہؓ بنت حسینؓ اور عائشہ بنت طلحہ بھی ان کی ناپاک کوششوں سے نہ بچ سکیں۔ انہوں نے اپنی دروغ بافیوں اور کذب و افترا کی مدد سے کنیزان حرم، بے باک شاہزادیوں اور رؤسا کی داشتاؤں کے لیئے ان معزز و محترم اور عالی نسب اور بلند سیرت خواتین کی زندگیوں کو مسخ کر کے پیش کیا تاکہ امراء و رؤسا کے شبستان عیش میں داد عشرت دینے والی عورتوں کے ضمیر یہ جھوٹے افسانے سنا کر سلا دیئے جائیں اور انہیں یقین آجائے کہ جب سیدنا

حضرت امام حسین علیہ السلام کی محبوب ترین بیٹی اور طلحہؓ ایسے جلیل القدر صحابی کی لخت جگر ان سب باتوں کو جائز اور مباح سمجھتی تھیں بلکہ خود ان کاموں کی سرپرستی کرتی تھیں تو ان کیلئے کیا قباحت ہو سکتی ہے؟

جہاں تک عائشہ بنت طلحہؓ کی علمی فضیلت اور ادبی کمالات کا تعلق ہے اسے اغانی میں بھی تسلیم کیا گیا ہے اور ان کے متعلق یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ عائشہ اپنے وقت کی بہت بڑی عالمہ اور ذہین خاتون تھیں۔ اپنے دور کے بڑے بڑے سیاست دانوں اور علماء و فضلاء سے وہ انتہائی عالمانہ گفتگو کرتی تھیں اور وہ سب ان کے فہم و تدبر سے بے حد متاثر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار ہشام نے انہیں اپنے دربار میں مدعو کیا۔ جب وہ آئیں تو ہشام نے ان کی علمی فضیلت اور ادبی قابلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے اعزاز میں وقت کے تمام بڑے بڑے علماء و فضلاء اور مشہور و معروف امرائے دربار کو جمع کیا۔ سب سے پہلے عرب سے متعلق معلومات اور شعر و ادب کا تذکرہ ہوا تو عائشہ کا پلہ ان سے بھاری تھا۔ نجوم پر گفتگو ہوئی تو ان کا علم کم نہ تھا، اسی طرح دوسرے تمام علوم عصریہ پر عائشہ نے اپنی فضیلت، علمی برتری اور قادر الکلامی کا لوہا منوالیا۔ سب نے متفقہ طور پر تسلیم کیا۔ عائشہ کا علمی اور ادبی مرتبہ بہت بلند ہے۔ خلیفۂ وقت ہشام ان سے اس قدر متاثر ہوا کہ ایک لاکھ درہم بطور نذرانہ پیش کئے اور شاہانہ اعزاز و آداب کے ساتھ انہیں مدینہ رخصت کیا۔

فاطمہؒ بنت عبدالملک

وہ فرض شناس اور نیک دل شاہزادی
جس نے شاہی محلات میں انتہائی ناز و نعم
کے ساتھ پرورش پائی۔ مگر اپنے درویش صفت
خاوند کے ساتھ فقر و فاقہ کی صبر آزما زندگی
بسر کی۔

فاطمہ بنت عبدالملک

خاندانِ بنوامیہ کے مشہور خلیفہ عبدالملک کی بیٹی تھیں۔ شاہی محلات میں انتہائی ناز و نعم کے ساتھ پرورش پائی۔ دنیا کے عظیم ترین مملکت کے فرماں رواکی لختِ جگر اور چہیتی بیٹی ہونے کی وجہ سے دنیا کی ہر نعمت میسر تھی۔ گھر میں زر و سیم کی گنگا بہہ رہی تھی۔ کنیزوں، لونڈیوں، غلاموں اور خدام کی ایک فوج ہر وقت خدمت کے لئے موجود رہتی۔ آپ نے غم و فکر اور رنج و محن سے کوسوں دور عیش و فراغت کے شاہانہ ماحول میں پرورش پائی۔ اور ایک عظیم الشان سلطنت کی شاہزادی کی حیثیت سے عنفوانِ شباب کی وادی میں قدم رکھا۔ باپ نے شادی کے لئے اپنے خاندان میں سے بہترین شخص کو منتخب کیا اور انتہائی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے نکاح کر دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے نام سے کون واقف نہیں آپ ایک دیندار، خدا ترس، عبادت گزار اور انصاف پرور مثالی حکمران کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ آپ نے خلیفہ مقرر ہوتے ہی خلافت راشدہ کی یاد تازہ کر دی اور تاریخ اسلام میں لازوال مقام حاصل کیا۔ فاطمہ بنت عبدالملک اسی درویش منش اور صاحب فقر خلیفہ کی بیوی تھیں۔ ۸۶ھ میں عبدالملک نے انہیں حجاز کا گورنر مقرر کر کے مدینہ بھیج دیا تو فاطمہ بھی ساتھ آئیں۔ اس وقت عمر بن عبدالعزیز بڑے ٹھاٹھ کی امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے خود اپنی ابتدائی زندگی کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا: "پھر مجھے لباس، خوشبو اور عیش و عشرت کا شوق تھا تو میری دانست میں

نہ میرے خاندان میں اور نہ دوسرے خاندان میں کوئی شخص ایسی امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا جس طرح یہ۔ کہا جاتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز امویوں میں سب سے زیادہ عیش پسند تھے۔ ان کی مغرورانہ چال کا نام ہی عمر کی چال مشہور تھا۔ محل کی لونڈیاں اور کنیزیں ان کی چال کی نقل کرتی تھیں۔ مگر فاطمہ نے ان کی زندگی میں داخل ہوتے ہی آہستہ آہستہ عیش و عشرت کے تمام ہنگاموں سے انہیں متنفر کر دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جتنی دیر مدینہ میں بحیثیت گورنر متکلم رہتے۔ فاطمہ ان کی ہمدرد و معاون بن کر رہیں اور اہل بیت کی محترم خواتین سے انہوں نے نہایت اچھے تعلقات استوار کرنے میں اپنے شوہر کی بہت مدد کی۔ ایک دفعہ حضرت فاطمہ بنت علیؓ ان سے ملنے تشریف لائیں تو عمر بن عبدالعزیزؒ بھی آ گئے۔ تمام پہرہ دار اور غلاموں کو باہر نکلوا دیا گیا تاکہ حضرت فاطمہ بنت علیؓ پوری بے تکلفی اور اطمینان سے بات چیت کر سکیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حضرت فاطمہ بنت علیؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے دختر علیؓ! روئے زمین پر مجھے کوئی خاندان تم سے زیادہ عزیز نہیں۔ تم خود میرے خاندان سے زیادہ مجھے عزیز ہو۔ اس کے بعد دونوں میاں بیوی نے حضرت فاطمہ بنت علیؓ کو انتہائی عزت و تکریم کے ساتھ رخصت کیا۔

سلیمان نے وفات سے پہلے ہی حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا چنانچہ ان کے مرتے ہی آپ نے جب عنان خلافت سنبھالی اور بیعت وغیرہ کے فرائض سے فارغ ہو کر سیدھے اپنی بیوی فاطمہ کے پاس تشریف لائے اور کہا کہ سلیمان نے مجھے خلیفہ بنا دیا ہے۔ اس لئے اب تو ایک خلیفہ کی بیوی ہے۔ اور خلیفہ کی بیوی جس کی کوئی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ اس لئے تمہارے پاس جتنے زیورات سونا، چاندی اور جواہرات ہیں سب بیت المال میں داخل کر دو کیونکہ یہ سب مسلمانوں کا مال ہے۔ ہمارا ساتھی وہ ہے جو اچھے کاموں میں ہماری مدد کرنے اور برے کاموں

سے ہیں روکے۔ ہماری راہنمائی کرے۔ ہمارے سامنے کسی کی چغلی نہ کھائے اور جس بات میں امداد نہ کر سکتا ہو اس میں مداخلت نہ کرے۔

کیسی عجیب و غریب بات ہے کہ ایک شخص اتنی بڑی مملکت اور رفیع الشان سلطنت کا فرمانروا مقرر ہوتا ہے تو سب سے پہلے اپنی بیوی کو حکم دیتا ہے کہ اپنا تمام قیمتی سامان اور زیورات سرکاری خزانہ میں جمع کراؤ کیونکہ یہ مسلمانوں کا مال ہے۔ ایک عورت وہ بھی لاڈلی شہزادی کے لیئے کتنی بڑی آزمائش ہے کیونکہ مشہور ہے کہ عورت کو سونے چاندی ہیرے جواہرات اور زیورات سے بہت محبت ہوتی ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے خلیفہ مقرر ہوتے ہی فاطمہ کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہوتا۔ خود خلیفہ انہیں بیش قیمت تحائف دیتے، روساء امراء اور مصاحبین نذرانے پیش کرتے۔ خود فاطمہ بھی حسب دستور کسی انتہائی گراں قیمت چیز کے لیئے فرمائش کر سکتی تھیں۔ ہم روزانہ اپنے اردگرد اس قسم کے کئی مناظر دیکھتے رہے ہیں کہ کسی کے خاوند کو معمولی ترقی ملی یا قدرے عہدہ بڑھ گیا تو بیوی نے یہ خوش خبری سنتے ہی زیورات وغیرہ کے لیئے فرمائش پیش کر دی۔ انہیں اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ خاوند ناجائز ذرائع یعنی رشوت، غبن اور دوسروں کی حق تلفی سے ان کی فرمائش پوری کرتا ہے۔ یا اپنی تنخواہ سے اس مطالبے کی تکمیل کا انتظام کرتا ہے۔ انہیں تو قیمتی زیورات اور ملبوسات سے سروکار ہوتا ہے۔ ایسی خواتین عموماً یہ دلیل دیا کرتی ہیں کہ اب آپ ماشاء اللہ افسر بن گئے ہیں۔ میرے پاس ترکوئی ڈھب کا زیور بھی نہیں۔ لوگ باگ دیکھ کر کیا کہیں گے کہ یہ افسر کی بیوی ہے۔ چاہیئے تھا کہ فاطمہ بھی اپنے خاوند سے یہی توقع رکھتیں۔ کیونکہ ان کا خاوند تو مشرق و مغرب کی ایک بہت بڑی سلطنت کا شہنشاہ بن گیا تھا۔ فاطمہ کی طرف سے فرمائش کا تو ذکر ہی کیا، الٹا انہیں اپنے تمام زیورات وغیرہ بیت المال میں داخل کرنے کا حکم مل گیا۔ حالانکہ انہیں اپنے خاوند

کی طبیعت میں بہت دخل تھا اور وہ بڑی آسانی کے ساتھ کہہ سکتی تھیں کہ یہ سب چیزیں میری ملکیت ہیں، میں انہیں سرکاری خزانے میں کیوں جمع کراؤں مگر آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ اللہ کی اس نیک بندی نے اسی وقت بلا حیل و حجت اپنی ایک ایک چیز بیت المال کے سپرد کر دی اور اف تک نہ کی۔ اسی پر بس نہیں۔ پھر حرم کی تمام کنیزوں اور خادموں کو طلب کر کے فرمایا کہ اب میں تم لوگوں کا خرچ برداشت نہ کر سکوں گا اس لیئے میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ شوق سے الگ ہو جاؤ۔ فاطمہ خود عبدالملک لیسے صاحب جاہ و جلال خلیفہ کی چہیتی بیٹی تھی۔ اور اس نے کبھی عسرت اور تنگ دستی کا نام تک نہ سنا تھا۔ خاوند نے حکومت سنبھالتے ہی پہلے انہیں مال و دولت سے محروم کیا پھر خدمت گاروں کو بھی سبکدوش کر دیا اور گھر کے کام کاج کا تمام بوجھ فاطمہ کے سر پر آ پڑا۔ کہتے ہیں فاطمہ کے پاس صرف ایک قیمتی جواہر باقی رہ گیا تھا جو ان کے باپ عبدالملک نے بطور یادگار دیا تھا اور فاطمہ اسے بہت عزیز رکھتی تھیں۔ کیونکہ وہ جواہر ان کے مرحوم باپ کی نشانی تھی۔ ایک روز حضرت عمر بن عبدالعزیز کو معلوم ہوا تو فاطمہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تمہیں دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے یا تو اس جواہر کو واپس کر دو اور بیت المال میں جمع کراؤ یا مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ۔"

اپنے درویش منش خاوند کا یہ حکم سن کر فاطمہ نے بلا تامل جواب دیا۔

"نہیں آپ کو اس جواہر پر کیسے قربان کر سکتی ہوں یہ تو کوئی چیز نہیں۔ میں اس سے بھی کئی گنا بیش قیمت جواہر پر آپ کو ترجیح دیتی ہوں۔"

چنانچہ انہوں نے فوراً اپنے باپ کی وہ آخری نشانی بھی خزانے میں جمع کرا دی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد یزید خلیفہ ہوا تو اس نے وہ جواہر فاطمہ کو واپس دینا چاہا مگر انہوں نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ جس چیز کو میرے

شوہر نے پسند نہیں کیا وہ ان کے بعد کیسے پسند کر سکتی ہوں مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے خلیفہ مقرر ہونے کے بعد فاطمہ نے انتہائی تنگدستی اور فقر و فاقہ سے زندگی بسر کی۔ اور اکثر وہ اپنی اولاد کی روزمرہ کی ضروریات بھی پورا نہ کر سکتی تھیں۔ ان کی اس فقیرانہ زندگی کا اندازہ کرنے کے لئے چند ایک واقعات اختصار سے پیش کرنا کافی ہیں۔ ایک دفعہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے لبنان کے شہد کا شوق ظاہر کیا۔ فاطمہؒ نے لبنان کے گورنر ابن معدی کرب کو کہلا بھیجا۔ اس نے فوراً حکم کی تعمیل میں بہت سا شہد بھیج دیا۔ جب یہ شہد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سامنے رکھا گیا تو فاطمہ سے پوچھا کہ کیا تم نے یہ شہد ابن معدی کرب کے ذریعے منگوایا ہے۔ انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو فوراً یہ شہد بازار میں فروخت کر کے قیمت بیت المال میں جمع کرا دی۔ دوسری مرتبہ پھر فاطمہ نے اپنے خاوند کی رغبت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ڈاک کی ایک سواری پر آدمی بھیج کر دو دینار کا شہد منگوا لیا کیونکہ عمر بن عبدالعزیز شہد بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ جب خلیفہ کو معلوم ہوا اسی وقت وہ شہد بھی فروخت کر دیا۔ اور دو دینار بیوی کو واپس کر کے باقی رقم خزانے میں جمع کرا دی۔ ایک بار سرکاری سیب تقسیم کر رہے تھے کہ آپ کا ایک چھوٹا سا بچہ آیا اور ایک سیب اٹھا کر کھانے لگا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سختی سے وہ سیب چھین لیا اور بچہ روتا ہوا ماں کے پاس واپس چلا گیا۔ انہوں نے اسی وقت بازار سے سیب منگوا کر بچے کو دے دیا۔ گھر آئے تو سیب کی خوشبو سونگھ کر پوچھا کہ گھر میں سرکاری سیب تو نہیں آئے؟ فاطمہ نے تمام واقعہ سنا دیا تو فرمایا کہ میں نے سیب اپنے بچے سے چھینا تو گویا اپنے دل سے چھینا لیکن مجھے یہ پسند نہ آیا کہ مسلمانوں کے ایک سیب کے لئے اپنے آپ کو برباد کروں۔

ایک دفعہ آپ کی ایک بیٹی نے فاطمہ سے پوچھے بغیر ایک موتی باپ کی خدمت میں بھیجا اور عرض کی کہ کان میں ڈالنے کے لئے اس کا جوڑا بھیج دیجئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس موتی کے ساتھ آگ کی دو چنگاریاں رکھ کر بھیج دیں ۔ اور کہلا بھیجا کہ اگر تم ان چنگاریوں کو کان میں ڈال سکو تو میں اس موتی کا جوڑا بھیج سکوں گا فاطمہ نے سنا تو بیٹی پر بہت ناراض ہوئیں اور بیٹیوں کو سمجھایا کہ اپنے جلیل القدر باپ کو تنگ نہ کیا کرو اور ان کی ذمہ داریوں کو سمجھنے کی کوشش کرو کیونکہ ان کا ساتھی وہی ہے جو نیک کاموں میں ان کی مدد کر سکے ۔

آپ کا معمول تھا کہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر لڑکیوں کی خیریت دریافت کرنے جایا کرتے تھے ۔ ایک رات گئے تو لڑکیوں نے آپ کی آہٹ سن کر ہاتھ سے اپنے منہ بند کر لیئے اور دروازے پر آگئیں ۔ آپ نے ان سے ایسا کرنے کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ ان کے پاس رات کے کھانے میں مسور کی دال اور پیاز کے سوا کچھ نہ تھا اس لیئے انہیں یہ پسند نہیں کہ پیاز کی ناگوار بو ان کے والد تک پہنچے ۔ اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیز رو پڑے اور کہا اے میری لڑکیو ! تم کو اس سے کیا فائدہ ہوگا کہ تم طرح طرح کے کھانے کھاؤ اور تمہارا باپ دوزخ کی آگ میں جھونک دیا جائے یہ سن کر تمام لڑکیاں چیخ چیخ کر رونے لگیں ۔ فاطمہ جس گھر کی ملکہ تھیں اس کا ایک اور منظر دیکھئے ۔ ایک روز حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنی چہیتی بیٹی امینہ کو نہایت پیار سے پاس بلایا لیکن وہ نہ آئی ۔ آپ سخت حیران ہوئے ۔ ایک آدمی کو بھیج کر پھر بلایا ۔ اور نہ آنے کی وجہ پوچھی تو امینہ نے کہا کہ امیر المومنین سے کہیئے کہ میرے پاس کپڑا نہیں ہے اس لئے میں حاضر خدمت ہونے سے قاصر ہوں ۔ مزاحم کو بلا کو حکم دیا کہ فرش پھاڑ کر امینہ کے لئے ایک قمیض تیار کروا دو ۔ اتفاق سے حضرت عمر کی بہن ام البنین بہت دولت مند تھیں ۔ جب انہیں اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے

ایک نعمان کپڑا بھیج دیا اور کہا کہ عمر سے کچھ نہ مانگو۔

آپ شاید یہ سن کر حیران ہوں کہ خلیفۂ اسلام امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیز کے گھر کا کل خرچ دو درہم روزانہ تھا اور فاطمہ اس حقیر رقم میں گھر کا گذارہ چلاتی تھیں۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے کبھی بیت المال پر اپنا بوجھ نہیں ڈالا۔ یہی وجہ تھی کہ فاطمہ اپنے بچوں کے ساتھ انتہائی غریبی اور مفلسی کی زندگی بسر کرتی تھی۔ ایک دفعہ عبداللہ بن ذکریا ان کے ہاں گئے۔ فاطمہ اور ان کے بچوں کی تنگدستی دیکھ کر ان کا دل بھر آیا حضرت عمرؓ سے کہا کہ امیر المومنین آپ اپنے حکام اور ملازمین کو سو سو دینار بلکہ اس سے بھی زیادہ تنخواہیں دیتے ہیں۔ جواب دیا کہ اگر وہ قرآن و حدیث کے مطابق عمل کریں تو یہ بہت کم ہے۔ میں ان کو معاش کے جھگڑوں سے بالکل نجات دلانا چاہتا ہوں۔ عبداللہ نے کہا کہ جب یہ جائز ہے اور آپ خود ان سب سے زیادہ کام کرتے ہیں تو آپ بھی مشاہرہ لیجئے اور اپنے اہل و عیال کی تنگ دستی دور کیجئے کہ وہ محتاجوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں مگر آپ نے انکار کر دیا — ایک روز فاطمہ کے پاس بیٹھے ان کی مفلسی سے متعلق باتیں کر رہے تھے تو دورانِ گفتگو فرمایا۔ فاطمہ! وہ زمانہ کتنا خوشگوار اور پرسکون تھا جب میں خلیفہ نہ تھا۔ فاطمہ نے جواب دیا یا امیر المومنین آپ اس زمانے سے زیادہ صاحبِ اختیار اور اہلِ مقدرت ہیں۔ غمگین ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا۔ فاطمہ! اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ فاطمہ یہ پر درد فقرہ سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا اے پروردگار! انہیں دوزخ کے عذاب سے بچانا۔

فاطمہ کو اپنے عظیم المرتبت شوہر کی مجبوریوں اور ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا وہ دیکھ رہی تھیں کہ حکومت کے ادنیٰ ملازمین اور معمولی کارندے تک عیش و عشرت

کی زندگی بسر کرتے ہیں مگر خلیفۂ اسلام جن کی ہیبت سے دنیا سہمی رہتی ہے۔ اپنے لیئے ایک درہم کے انگور نہیں خرید سکتے۔ اور ان کی ناز ونعم سے پلی ہوئی بیوی اور بچے دنیا کی ہر نعمت کے لیئے ترستے رہتے ہیں۔ ان کے اپنے گھر میں فاقہ ہوتا تھا۔ مگر دوسروں کی حاجت روائی اور اعانت میں صبح و شام مصروف رہتے تھے۔ ایک دفعہ عراق سے ایک نادار عورت آئی جس کے ساتھ پانچ لڑکیاں بھی تھیں اس نے خلیفۂ اسلام کا ویران اور شکستہ حال گھر دیکھ کر کہا کہ میں اس ویران گھر سے اپنا گھر آباد کرنے آئی ہوں۔ فاطمہ نے ہنس کر کہا کہ تم لوگوں کے گھروں کی آبادی ہی نے اس گھر کو ویران بنا رکھا ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ میرے شوہر کو ہر لحظہ ملت اسلامیہ کے ہر فرد کی فکر دامن گیر رہتی ہے وہ اپنے گھر کی طرف کیسے توجہ دے سکتے ہیں

تھوڑا عرصہ بعد ہی دشمنوں نے سازش کر کے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو زہر دے دیا اور آپ اس کے اثر سے سخت بیمار ہو گئے تو فاطمہ ہر وقت ان کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی تھیں۔ صبح و شام ان کی تیمارداری کرتی تھیں اور رو رو کر بارگاہِ رب العزت میں اپنے شوہر کی صحت مندی کے لیئے دعائیں مانگتی تھیں۔ ایک روز فاطمہ نے ان سے کہا کہ یا امیر المومنین! آپ میری موجودگی کی وجہ سے سوتے نہیں ہیں۔ میں باہر چلی جاتی ہوں۔ شاید آپ کو نیند آجائے۔ یہ کہہ کر آپ دروازے کے باہر بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے محسوس کیا کہ حرکت وغیرہ نہیں ہوتی۔ اندر آکر دیکھا تو دنیائے اسلام کی یہ نامور شخصیت اپنے اللہ کے حضور میں پہنچ چکی تھی۔

وفات کے وقت آپ نے اپنے بیوی بچوں کے لیئے نہ کوئی جائداد چھوڑی اور نہ کوئی اندوختہ۔ فاطمہ ان کے بعد کافی عرصہ تک زندہ رہیں۔ جب بھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ذکر ہوتا۔ ان کی آنکھیں دفورِ غم سے اشکبار ہو جاتیں۔

اس وقت ہے کوئی ایسی صابر و شاکر عورت جو فاطمہ بنت عبد الملک کا ہی مقابلہ کر سکے۔ فاطمہ کوئی معمولی عورت نہ تھیں۔ ان کا ماضی بے حد تابناک اور مسرت آفرین تھا۔ وہ سلطنتِ اسلامیہ کی شہزادی تھیں۔ اور عیش و آرام سے زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں۔ فاقہ کشی اور محتاجی تو بہت دور کی چیزیں ہیں۔ انہیں کبھی یہ محسوس نہ ہوا تھا کہ وہ کب کسی خواہش کا اظہار کرتی ہیں۔ اور کب اسے پورا کیا جاتا ہے۔ کہاں وہ عیش و آرام اور شان و شوکت کی زندگی اور کہاں یہ مفلسی۔ وہ گردشِ روزگار کا شکار نہ ہوئی تھیں۔ اور نہ ان کے اقتدار و اختیار میں کوئی کمی ہوئی تھی۔ وہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے ساتھ اس فقر و فاقہ کی حالت میں رہنے پر مجبور نہ تھیں۔ خاوند قلمروئے اسلامیہ کا تاجدار تھا۔ تمام رشتہ دار بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ شاہی خاندان سے تھیں اور ایک صاحبِ شان و سطوت خلیفہ کی بیٹی تھیں۔ انہیں کسی چیز کی کمی نہ تھی مگر انہوں نے کسی چیز کی پروا نہ کی اور آخر دم تک پورے صبر و استقلال کے ساتھ اپنے نیک دل اور خدا پرست خاوند کے ساتھ مصیبت و عسرت کی زندگی بسر کی۔ ان کی ذرا سی تکلیف پر بے تاب ہو جاتی تھیں۔ ان کی خدمت اور دل نوازی میں کوئی کمی نہ ہونے دیتی تھیں۔ اپنی اولاد کو کس مپرسی اور حسرت کے عالم میں دیکھتی تھیں مگر مہر بلب رہتی تھیں۔ ان حالات میں بھی انہوں نے اپنے درویش شوہر کا کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔

ہماری ان بہنوں کے لئے مقامِ عبرت ہے جو چند لقموں کی کمی برداشت کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہیں۔ کسی مجبوری اور مصیبت کے باعث ان کی ضروریات میں ذرا سا فرق آ جائے تو گھر میں ہنگامہ برپا کر دیتی ہیں اور شوہر کے لئے جینا حرام کر دیتی ہیں۔ بلکہ گئی تو برے دنوں کے آثار دیکھتے ہی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر چل دیتی ہیں یا پھر طلاق کے مطالبات شروع ہو جاتے ہیں۔

شہزادی فاطمہ ——— ہمیں سلطنت اسلامیہ کی ملکہ فاطمہ بنت عبد الملک کی زندگی ہماری خود غرض اور عیش و عشرت کی دلدادہ بہنوں کے لئے ایک معنی خیز درس ہے۔

زبیده خاتون

ہارون الرشید کی عظمت و شوکت کا راز۔
جس کے ذوقِ قرآن خوانی کی بدولت شاہی
محلات کے در و دیوار ہر وقت قرآن مجید
کی قراءت سے گونجتے رہتے تھے ۔۔۔
جن کی لونڈیاں اور کنیزیں تک قرآن مجید کی
حافظہ تھیں۔

ہارون الرشید کی عظمت

زبیدہ خاتون

زبیدہ خاتون

آپ حضرت عباسؓ کی اولاد سے تھیں۔ اصل نام امۃ العزیز تھا اور ام جعفر کنیت تھی۔ ان کے دادا خلیفہ منصور کو بہت زیادہ محبت تھی وہ جب تک اپنی پوتی کو دیکھ نہ لیتے چین نہ آتا تھا خلیفہ منصور نے بچپن میں ان کا نام زبیدہ رکھا تھا جو آج تک تاریخ کے اوراق پر جلی حروف میں کندہ ہے۔ ان کے ہوش سنبھالتے ہی دستورِ شاہی کے مطابق قرآن کریم اور احادیث کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے قابل اور لائق اساتذہ مقرر ہوئے۔ اسی عمر سے قرآن مجید سے دلی اور روحانی تعلق پیدا ہوا جو تادمِ آخر قائم رہا۔ قرآن مجید اور احادیث کی تعلیم سے فارغ ہو کر انہوں نے عربی ادب اور دیگر علوم عصریہ پر عبور حاصل کیا۔ نہایت ذہین، سلیم الطبع اور روشن دماغ تھیں۔ تعلیم و تربیت کے ان تمام مراحل کو بڑی تیزی سے طے کر کے گلستانِ علم و حکمت میں شگفتہ پھول بن کر مہکنے لگیں۔ اسلام کی شیدائی تھیں۔ اور ہر وقت اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں سرشار رہتی تھیں۔ عنفوانِ شباب کے عالم میں بھی مذہبی امور سے حیرت انگیز حد تک دلچسپی تھی۔ بڑی پابندی اور اہتمام کے ساتھ پانچوں وقت نماز ادا کرتی تھیں اور باقاعدگی سے روزے رکھتی تھیں۔ آپ کی شادی دورِ عباسیہ کے مشہور خلیفہ ہارون الرشید سے ہوئی۔ یہ وہی ہارون الرشید تھے جن کے دورِ حکومت کو مؤرخین سنہری زمانہ قرار دیتے ہیں۔ زبیدہ سے شادی کے ایک سال بعد ہارون الرشید کو ولی عہد نامزد کر دیا گیا۔ میاں بیوی میں بے حد

محبت تھی۔ سفر و حضر میں اپنے خاوند کے ساتھ رہتی تھیں۔ جب ہارون الرشید سریر آرائے سلطنت ہوئے تو زبیدہ ان کی دستِ راست ثابت ہوئیں۔ خلیفہ امورِ سلطنت میں ان سے مدد لیتے اور پیچیدہ سے پیچیدہ سیاسی مسائل اور پریشان کن معاملات ان کی اصابتِ رائے کے سامنے بے حقیقت تھے۔ انہوں نے اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت سے سلطنتِ عباسیہ کی عظمت و شوکت کو چار چاند لگا دیئے۔ یہ ان کی بیدار مغزی اور عقل و فراست تھی کہ تاریخِ اسلام کے شخصی دورِ حکومت میں ہارون الرشید کا زمانہ سنہری زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ زبیدہ حرمِ شاہی میں رہتے ہوئے بھی سلطنت کے تمام چھوٹے بڑے امور سے ہر لحظہ آگاہ رہتی تھیں اور تمام معاملات پر کڑی نگاہ رکھتی تھیں حالانکہ یہ ان کی عظمت اور عروج و اقتدار کا زمانہ تھا اور اس وقت ان کا آفتابِ مقدر نصف النہار پر تھا۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے کبھی اسلامی شعائر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان کی عبادت گزاری اور احکامِ شریعت کی پابندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ روزانہ اسی خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں پانچوں وقت حاضر ہو کر توبہ و استغفار کرتی تھی وہ اپنے وقت کی سب سے زیادہ فیاض، دریا دل اور سخی خاتون تھیں۔ ان کی نیکی، پاکدامنی اور عفت و عصمت خاندانِ عباسیہ میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی۔ قرآن مجید سے گویا انہیں والہانہ عشق تھا۔ تلاوتِ قرآن ہی میں ہمیشہ سکونِ قلب پاتی تھیں۔ حرمِ شاہی کی فضا ہر وقت قرآن خوانی سے معمور رہتی تھی۔ ان کی صرف یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ جہاں بھی ہوں قرآن مجید کی پاک قراءت کے سوا اور کوئی آواز ان کے کانوں میں نہ پہنچے۔ اسی محبت اور ذوق کی بدولت انہوں نے سینکڑوں عورتوں کو قرآن حفظ کرایا۔ خود ان کی اپنی کنیزوں میں ایک سو کے قریب قرآن شریف کی حافظ تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کا فرض تھا کہ روزانہ تین سیپارے پڑھ کر سنائیں گویا قصرِ شاہی میں روزانہ دس مرتبہ قرآن شریف ختم کیا جاتا تھا۔ ان حافظ کنیزوں سے اس

کے سوا اور کوئی کام نہ لیا جاتا تھا اور زبیدہ ان سب کو بے حد عزیز رکھتی تھیں کیوں نہ ہوتا، ان کے سینوں میں وہ لازوال دولت پوشیدہ تھی جو زبیدہ کو ملک و سلطنت سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ہارون الرشید کے دورِ حکومت میں زبیدہ کا محل ہر وقت روح پرور قرأت سے گونجتا رہتا تھا اور وہاں سے گزرنے والا ہر شخص ایک لمحہ کے لئے محسوس کرتا تھا کہ وہ قدسی نفوس سے فیضیاب ہونے والوں کی بستی میں آگیا ہے۔ زبیدہ وہ مبارک ہستی تھی جن کی بدولت سینکڑوں عورتوں کو حافظۂ قرآن بننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

دورِ عباسیہ کے جاہ و جلال اور شوکت و حشمت کا یہ وہ زمانہ تھا جب ہر طرف عیش و عشرت کی فراوانی تھی۔ امرائے دربار اور رؤسائے سلطنت کا ذکر کیا عام لوگوں کے گھروں میں بھی عیش و نشاط کی محفلیں آراستہ رہتی تھیں، خوشحالی اور فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ لوگ عیش و طرب کے ہنگاموں میں کم و بیش عادی ہوچکے تھے۔ شاہی محلات میں رقص و سرود اور عیش و نشاط کے چشمے بہہ رہے تھے گویا اس وقت ایسا ماحول تھا کہ دارالسلطنت کے کوچہ و بازار میں موسیقی اور غنا کے ہنگامے گرم رہتے تھے۔ ہر طرف نغمات کی بارش ہو رہی تھی ایسے حالات میں دوسرے کئی اللہ کے نیک بندوں کی طرح زبیدہ کا محل بھی ان تمام بداعتدالیوں اور لہو و لعب کے ہنگاموں سے یکسر پاک تھا۔ انہوں نے اتنی بڑی سلطنت کی ملکہ ہونے کے باوجود وقت کے چلن کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور اپنے محل کی چاردیواری کے اندر کبھی کسی خلافِ شرع فعل کے ارتکاب کی اجازت نہ دی۔ اس روشن ضمیر ملکہ کا محل ذکرِ الٰہی کے روح پرور ترانوں سے گونجتا رہا اور وہاں کلامِ الٰہی کی آواز کے سوا کسی دوسری آواز کو بلند ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ہارون الرشید نے وفات سے قبل زبیدہ کے بیٹے امین اور دوسری بیوی کے بیٹے مامون الرشید

کو خلیفہ مقرر کیا۔ امین نے مسندِ شاہی پر قدم رکھتے ہی اپنے سوتیلے بھائی مامون الرشید کو معزول کر دیا لیکن زبیدہ نے اس ناانصافی اور ظلم کی شدید مخالفت کی مگر امین نے ان کی ایک نہ سنی۔ مامون الرشید نے اپنی حق تلفی کا بدلہ لینے کے لئے بھائی کے خلاف بغاوت کر دی اور امین کو قتل کر دیا۔ مامون الرشید کی شادی کے بعد زبیدہ زبیدہ حج ادا کرنے کی غرض سے حجاز تشریف لے گئیں۔ کعبۃ اللہ میں لوگوں نے ان سے شکایت کی کہ حج کے ایام میں یہاں پانی نہ ملنے کی وجہ سے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زبیدہ نے اسی وقت بغداد سے ماہر اور لائق انجینئروں کو وہاں بلایا اور ایک نہر کا نقشہ تیار کرنے کا حکم دیا جو دریائے دجلہ سے مکہ اور وہاں سے مدینہ تک جائے۔ انجینئروں نے بڑی محنت سے تمام علاقے کا مفصل جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہاں نہر کھودنا بہت مشکل کام تھا کیونکہ چاروں طرف ریگستان پھیلا ہوا تھا اور راستے میں خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑ کھڑے تھے۔ اگر نہر کھودی بھی جاتی تو آندھیوں اور طوفانوں کے ساتھ اڑنے والے ریت کے تودے اسے بھر پر کر دیتے۔ چنانچہ انجینئروں نے یہ صورتِ حال زبیدہ کے سامنے پیش کی اور اس کام کو ناممکن قرار دیا۔ مگر زبیدہ نے ان کی ایک نہ سنی اور نہر تیار کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ کس کی مجال تھی کہ تعمیل نہ کرتا فوراً نقشہ تیار کیا گیا۔ ریت کے تودے الٹ کر اور پتھریلے پہاڑ کاٹ کاٹ کر دس میل لمبی نہر تیار ہوئی جس پر زبیدہ نے پانی کی طرح دولت صرف کر دی۔ یہی وہ نہر ہے جو نہر زبیدہ کے نام سے آج تک مشہور ہے اور اب بھی حجاز میں موجود ہے۔ نہر زبیدہ جس کاریگری اور ہنر مندی تیار ہوئی اس کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ اسے دنیا کے عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ زبیدہ نے اپنے قیام کے دوران مکہ سے مدینہ منورہ تک بے شمار کارواں سرائیں بنوائیں اور واپسی کے چھ برس بعد انتقال کیا۔ یہ بھی مشہور ہے

کہ شہر اسکندریہ ویران پڑا تھا اور بالکل اجڑ چکا تھا۔ زبیدہ نے اسے از سرِ نو تعمیر کرایا اور آباد کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی مسجدیں اور سرائیں بنوائیں۔

زبیدہ اگر یہ نہر نہ بھی بنواتیں تو ان کا نام قرآن مجید کی لازوال عظمت و رفعت کے سائے میں ہمیشہ زندہ رہتا اور ہر وہ مسلمان جو کتابِ الٰہی کو عزیز رکھتا ہے زبیدہ کو کبھی فراموش نہ کرتا۔ ہماری تعلیم یافتہ بہنوں کو سوچنا چاہیئے کہ تاریخ کے اس سنہری دور میں بھی علوم و فنون کا آج سے کہیں زیادہ چرچا تھا۔ بڑے بڑے علماء اور فضلاء اس وقت دارالسلطنت میں جمع تھے اور ہارون الرشید کے دربار میں علم و حکمت کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ دنیا بھر کے علوم و فنون کا مرکز بغداد تھا۔ صاحبِ علم ہستیوں اور کمالِ فن رکھنے والوں کی سرکاری طور پر سرپرستی ہوتی تھی ــــ فلسفہ ریاضی، ہیئت، ادب، شاعری، مصوری، سیاست، لسانیات اور فلکیات کے علاوہ بے شمار دوسرے علوم کا سرچشمہ وہی شہر تھا۔ مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے سلطنت کی ملکہ بلکہ حکمران خاتون نے جو خود بھی علم و فضل کا پیکر تھی قرآن مجید کو سب پر ترجیح دی اور اسی کو حاصلِ زیست بنایا ــــ آج یہ حالت ہے کہ دنیا کے تمام علوم و فنون پر عبور حاصل کرنے کا جنون سروں پر سوار ہے۔ صرف قرآن کریم کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ اس کی تعلیم بھی حاصل کی جائے کتنا بڑا فرق ہے ذہنی غلامی اور آزادی میں ــــ یہ درحقیقت پستی اور بلندی کا فرق ہے۔ ایک عورت کنیزوں تک کو قرآن حفظ کرا دیتی ہے اور آج اکثر خواتین کو کلمہ بھی ٹھیک سے پڑھنا نہیں آتا۔

شہزادی عباسہ

تدبر و ذہانت کا ایک نادر نمونہ تھیں

اور عورتوں کو ناقص العقل ہونے کا جو طعنہ

دیا جاتا ہے اس کا مجسم جواب تھیں عباسی

دور کے تجربہ کار ریاست دان ان کی عقل و

فراست کے قائل تھے۔

شہزادی عبّاسہ

مہدی بن منصور کی بیٹی اور خلیفہ ہارون الرشید کی سب سے چھوٹی بہن تھیں خاندانِ عباسیہ کی شاہی روایات کے مطابق ابتدائی تعلیم و تربیت مشہور علمائے دربار کی نگرانی میں حاصل کی اور دورِ عباسیہ کی پرشوکت شہزادیوں کی طرح محلات میں پرورش پائی۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر اور شرح پر حیرت انگیز حد تک عبور حاصل تھا۔ انتہائی فصیح و بلیغ اور پرحکمت انداز میں قرآن مجید کی مشکل آیات کی تفسیر بیان کیا کرتی تھیں اور اکثر مشکل مسائل کو اس خوبی کے ساتھ بیان کیا کرتی تھیں کہ بڑے بڑے درباری علماء دنگ رہ جاتے تھے۔ ان کی قابلیت اور دینی معلومات عام علماء سے کہیں زیادہ تھیں۔ پہلا نکاح محمد بن سلیمان سے ہوا لیکن وہ جلد ہی فوت ہو گئے تو ہارون الرشید نے اپنے ایک عزیز ابراہیم بن صالح سے ان کی شادی کر دی۔

عباسہ ایک خوش بیان اور باکمال شاعرہ تھیں کیونکہ انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم نہایت اعلیٰ پیمانے پر حاصل کی تھیں اس لیئے ادبی امور اور شعر و سخن کے معاملات میں ان کی رائے بہت وسیع خیال کی جاتی تھی۔ ویسے بھی شعر فہمی اور سخن سنجی میں کوئی عورت ان کی ہم پایہ نہ تھی۔ اکثر جب خلیفہ کی نجی مجالس میں شعر و ادب پر بحث ہوتی تو تمام اختلافی امور میں عباسہ سے مشورہ حاصل کیا جاتا اور وہ ایسی جچی تلی رائے دیتی تھیں کہ لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔ اللہ تعالےٰ

نے آواز میں کمال درجہ کا لوچ عطا فرمایا۔ جب قرآن مجید قرأت سے پڑھتی تھیں تو سننے والوں پر سحر کی کیفیت طاری ہو جاتی اور اس وقت وہ پورے احول پر روحِ تقدس بن کر چھا جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ شاہی محل کی تمام بزرگ خواتین ہر وقت عباسہ سے قرأت کے ساتھ قرآن مجید سننے کی آرزومند رہتی تھیں۔ جب بھی عباسہ سامنے آتیں ان سے یہی فرمائش کی جاتی کہ قرأت سے قرآن پڑھ کر سنائیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن خوانی کے اعلےٰ ذوق اور دلی شوق و شغف کے بغیر اس خصوصیت کا پیدا ہونا ممکن نہیں تھا۔ خصوصاً ایسے احول میں جب کہ شخصی حکومت کے تمام تقاضے کسی نہ کسی صورت میں موجود تھے اور شاہی خاندان کے اکثر افراد کا ان سے متاثر ہونا کوئی عجیب بات نہ تھی۔

عباسہ بہت زیرک، معاملہ فہم، دوراندیش اور ذہین ہونے کے علاوہ اپنے خاندان کی بے حد خیر خواہ تھیں۔ انہیں اختلافات، افتراق و انتشار اور لڑائی جھگڑے سے سخت نفرت تھی۔ وہ عباسی خاندان کے مختلف افراد کے تعلقات کو خوشگوار بنانے میں دن رات مصروف رہتی تھیں۔ ان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ مملکتِ اسلامیہ کے ذمہ دار اور صاحبِ اختیار افراد باہم صلح و آشتی اور یگانگت کے ساتھ امورِ سلطنت کو انجام دیں۔ جب بھی کسی بات پر اختلاف پیدا ہوتا تھا عباسہ اسے اچھے طریقے سے ختم کرنے کے لئے اپنا پورا اثر و رسوخ استعمال کرتی تھیں۔ کیونکہ انہیں علم تھا کہ شاہی خاندان کی ناچاقی اور بے اتفاقی سے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط ہوں گے جو ہر وقت مسلمانوں کی اس عظیم الشان سلطنت کو نیست و نابود کرنے کے لئے تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔ عباسہ تاریخ کی اس حقیقت کو خوب سمجھتی تھیں کہ ماضی میں دنیا کی تمام بڑی بڑی حکومتیں امرا کی سازشوں اور تخت و تاج کے وارثوں میں جنگ و جدال کی وجہ سے تباہ و برباد

ہوتی رہی ہیں۔ باہمی مخاصمت، دشمنی، حسد، رقابت اور ناچاقی نے کئی قوموں کو صفحہ قرطاس سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔ جس گھر یا سلطنت اور قوم میں پھوٹ اور نااتفاقی پیدا ہو جائے۔ ہمیشہ دشمن ہی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کی تباہی یقینی ہوتی ہے۔ اس وقت اگرچہ سلطنتِ عباسیہ شان و شوکت اور قوت و دبدبہ کے اعتبار سے اپنے عروج پر تھی لیکن مسلمانوں کے بے شمار دشمن مناسب وقت کے انتظار میں چاروں طرف تاک لگائے بیٹھے تھے۔ ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ کسی طرح مسلمانوں میں پھوٹ اور انتشار کی بیماری پیدا کر دیں اور شاہی خاندان کے افراد کو خانہ جنگی میں الجھا دیں تاکہ مسلمانوں کی طاقت آپس میں لڑ بھڑ کر فنا ہو جائے اور سلطنت زیادہ سے زیادہ کمزور ہو جائے تو وہ اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔ عباسہ وقت کے سیاسی حالات اور تقاضوں سے پوری طرح باخبر تھیں اور اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق ہمیشہ ان فتنوں کا سدِباب کرنے میں پوری مدد دیتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اسلام اور مسلمانوں سے محبت رکھنے والا۔ ہر دردمند شخص اس طرح سوچ سکتا ہے کیونکہ جب دشمن حکومت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا جبر و تشدد صرف شاہی خاندان تک ہی نہیں رہتا بلکہ شاہی خاندان کے افراد کی تمام بداعمالیوں اور گناہوں کی سزا پوری قوم کو بھگتنا پڑتی ہے جیسے ایک گھر میں باپ یا ماں کی خلافِ قانون حرکت اور جرم سے پورا گھر متاثر ہوتا ہے اور گھر کے کسی بڑے شخص کی بدکرداری پورے خاندان کو تباہ و برباد کر دیتی ہے حتیٰ کہ معصوم اور بے گناہ بچوں کا مستقبل بھی تباہ ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح کسی ملک کے حکمران کے اعمال کی سزا ساری رعایا کو ملتی ہے اور فاتح دشمن کی چمکتی ہوئی تلوار ہر شخص کے سر پر بلا امتیاز موت بن کر لہراتی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ شہزادی عباسہ شاہی خاندان کی باہمی رنجشوں اور کدورتوں

سے ہمیشہ آزردہ خاطر ہو جاتی تھیں اور انہیں اس قسم کے واقعات سے بہت صدمہ پہنچتا تھا۔ ہادی اور ہارون الرشید کی ولی عہدی کے لئے خطرناک اختلاف پیدا ہوا تھا۔ اور شہزادی عباسہ نے اس میں جو نا قابل فراموش کردار ادا کیا تھا۔ اس سے عباسہ کی اس خصوصیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ خلیفہ مہدی کے دو بیٹے ہادی اور ہارون الرشید ملکہ خیزران کے بطن سے تھے خلیفہ بڑے بیٹے ہادی کو ولی عہد مقرر کرنا چاہتے تھے مگر ملکہ خیزران کو علم تھا کہ مہدی خلافت کی اہم ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل نہیں کیونکہ وہ بہت زیادہ عیش پرست کمزور طبیعت اور نا اہل تھا۔ اس کے برعکس ان کی خواہش تھی کہ چھوٹے بیٹے ہارون الرشید کو ولی عہد نامزد کیا جائے۔ ہارون الرشید اپنے بڑے بھائی ہادی کی نسبت بہت زیادہ سمجھدار زیرک اور دور اندیش تھے۔ اور ہر لحاظ سے اس منصب کے اہل تھے۔ خلیفہ مہدی نے اس پریشانی سے نجات حاصل کرنے کے لیئے دونوں کو ولی عہد مقرر کر دیا اور یہ وصیت کر دی کہ ہادی کے بعد ہارون الرشید کو خلیفہ بنایا جائے۔ مہدی کی وفات کے بعد جب ہادی خلیفہ ہوا تو ہارون الرشید نے اظہار اطاعت کے طور پر سب سے پہلے اپنے بھائی کے ہاتھ پر بیعت کی مگر ہادی نے انہیں ولی عہدی سے معزول کر کے اپنے نابالغ بیٹے جعفر کو ولی عہد بنانے کا اعلان کر دیا۔ ہادی کی اس بے انصافی اور بد دیانتی کی وجہ سے سخت نازک صورت حال پیدا ہو گئی اور قریب تھا کہ مسلمانوں کی یہ عظیم الشان سلطنت ان دو حقیقی بھائیوں کی خانہ جنگی کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو جائے۔ جب معاملہ بہت زیادہ بگڑتا ہوا نظر آنے لگا تو شہزادی عباسہ سخت بے چین ہو گئیں اور ان کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ کس طرح اس جھگڑے کا کوئی قابل قبول حل مل جائے جس سے باہمی خونریزی رک جائے۔

ایک روز شہزادی عباسہ نے ہادی کو خوش و خرم دیکھ کر اسے ہنسی مذاق کی باتوں سے بے حد محظوظ کیا۔ اور اسے بے شمار دلچسپ لطیفے اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں سنائیں ہادی اتنا خوش ہوا کہ اس نے موج میں آ کر شہزادی عباسہ سے کہا۔ بہن! میرا دل چاہتا ہے کہ آج تم اپنے بھائی سے کچھ مانگو تو وہ تمہیں دل کھول کر دے۔ عباسہ نے قدرے سوچ کر جواب دیا بھائی! میں جو کچھ مانگوں گی آپ نہ دے سکیں گے۔ ہادی ایسے خلیفۂ وقت کے لیئے یہ طعنہ بہت بڑا تھا۔ اس نے سنجیدگی سے کہا کہ یہ ناممکن ہے کہ میں تمہاری خواہش کو پورا نہ کرسکوں۔ مانگو کیا مانگتی ہو۔ عباسہ نے پھر کہا کہ مانگوں؟ کہا "ہاں ضرور مانگو" عباسہ نے جواب دیا۔ میری خواہش ہے کہ آپ ہارون الرشید کو معزول کرنے کا خیال ترک کر دیں۔ ہادی کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ عباسہ نے یہ صورت دیکھ کر کہا کہ میرے بھائی! اس مطالبے میں میری کوئی ذاتی غرض شامل نہیں ہے۔ ہارون کے خلیفہ ہو جانے سے مجھے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچے گا۔ میں تو صرف خلافت عباسیہ کی حفاظت اور بقا چاہتی ہوں۔ میرے پیش نظر مسلمانوں اور ملک کی بہتری ہے۔ ولی عہد ابھی نابالغ ہے اور آپ کا یہ کام کئی فتنے پیدا کرنے کا موجب بن جائے گا۔ ہادی نے اپنے بیٹے کے حقوق کا سوال بڑی شدومد سے اٹھایا تو شہزادی عباسہ نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ یہ وصیت کر دیں۔ اگر اس وقت تک آپ کا بیٹا جعفر جوان نہ ہو تو ہارون الرشید کو خلیفہ بنا دیا جائے۔ عباسہ نے ہادی کو پوری طرح قائل کر لیا تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے یہ تجویز منظور کر لی۔ اس طرح شہزادی عباسہ نے نہ صرف عباسی خلافت کو تباہی سے بچا لیا بلکہ تاریخ کو ہارون الرشید ایسے بے نظیر حکمران سے محروم نہیں ہونے دیا۔

حضرت فاطمہ نیشاپوریؒ

"میری استاد فاطمہؒ نے فرمایا ہے کہ کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس کا انہیں علم نہ تھا۔"

(حضرت بایزید بسطامیؒ)

"مکہ میں ایک عورت فاطمہ نیشاپوریؒ نامی ہے۔ جو بزرگ ترین ہے۔ قرآن مجید کے حقائق و معانی اس طرح بیان کرتیں کہ مجھے ان پر رشک آتا تھا۔"

(حضرت ذوالنون مصریؒ)

"جو کوئی اللہ کے لئے اس طرح نیک عمل کرے گویا خدا سے دیکھ رہا ہے تو اس سے زیادہ خلوص کسی میں نہیں ہو سکتا اور جس کے عمل خیر میں خلوص ہو اس سے زیادہ خدا کا نیک بندہ کون ہو سکتا ہے۔"

(فاطمہ نیشاپوریؒ)

فاطمہ نیشاپوریؒ

آپ کا نام فاطمہ تھا۔ نیشاپور میں پیدا ہوئیں اور تیسری صدی ہجری کے شروع کا زمانہ پایا۔ اس وقت دنیائے فقر و غنا اور جہانِ زہد و عبادت و ولایت پر حضرت بایزید بسطامیؒ اور حضرت ذوالنونؒ مصریؒ ایسے بلند پایہ اولیاء اللہ اور جلیل القدر بزرگوں کا جلال و جمال چھایا ہوا تھا۔ اس وقت جہاں ایک طرف شخصی حکومت کے مفاسد عام تھے وہاں علم و حکمت اور فضل و کمال کے دریا بھی پوری روانی کے ساتھ موجزن تھے۔ علماء، فضلاء، مفسرین اور محدثین کی ایک بہت بڑی جماعت موجود تھی جو پوری ملتِ اسلامیہ کا نچوڑ سمجھی جاتی تھی۔ فاطمہ نے زاہد و عابد اور باعمل علمائے عصر کے زیرِ سایہ رہ کر علم و فضل میں کمال حاصل کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ صرف شاہزادیاں اور شاہی محلات میں رہنے والی بیگمات ہی علم و فضل میں کمال حاصل نہیں کر سکتیں بلکہ ایک غریب عورت کا بے پناہ شوق اور عشق اسے علم و حکمت کی ان بلند ترین چوٹیوں تک پہنچا سکتا ہے۔ جہاں اوجِ ثریا بھی سجدہ ریز ہے۔ صرف علم حاصل کر لینا اور کتابوں کو حفظ کر لینا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کی روشنی میں عمل کی پُرخطر اور خارزار وادیوں کو طے کر کے منزلِ مقصود تک پہنچنا حصولِ علم کا حقیقی مقصد ہوتا ہے۔ جس طرح علم سے بے نیاز عمل گمراہی کا باعث ہو سکتا ہے اسی طرح عمل کے بغیر علم فکر و نظر کا فساد بن سکتا ہے اور یہ فساد انسان کو تباہی کے عمیق غاروں میں گرا دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ مردوں کی تاریخ تو ایسے راہ نوردانِ شوق سے بھری پڑی ہے جنہوں نے بے پناہ مصائب برداشت کر کے اور افشانی

خواہشات کی سنہری زنجیروں کو توڑ کر عمل کی منازل طے کیں اور قابلِ رشک بلندیوں تک جا پہنچے۔ مگر عورتوں میں یہ مرتبہ بہت کم ہستیوں کو نصیب ہوا ہے۔ ان کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کے لیے آسمان کی رفعتوں کو چھونے اور شرف و امتیاز کے بلند ترین مقامات حاصل کرنے کے تمام دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں اور اسلام نے ان راستوں پر جبر و تشدد اور ظلم کے پہرے نہیں بٹھائے بلکہ قرآن کی انگشتِ شہادت تو ہر وقت ان راستوں کی طرف پیش قدمی کرنے کی دعوت دیتی رہتی ہے ضرورت صرف خلوصِ نیت، عمل پیہم اور شوق و جستجو کی ہے۔ فاطمہ نیشاپوری اگرچہ علم و فضل کا ایک دریا تھیں مگر ان کے علم نے انہیں سطحیت کا اسیر نہیں رکھا کہ وہ ہر وقت اسی نشے میں سرشار رہیں کہ وہ علم و حکمت کے میدان میں لاکھوں پر بھاری ہیں اور بہت کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں، کبر و غرور اور فخر و نخوت کو انہوں نے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا بلکہ جتنا ان کا علم بڑھتا گیا وہ اتنی ہی زیادہ منکسر المزاج، حلیم الطبع اور زاہدہ و عابدہ بنتی گئیں۔ ان کا ذوقِ عبادت اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ ساری ساری رات نوافل پڑھنے میں گزار دیتی تھیں اور ان کی ہر بات میں ذکرِ الٰہی کا رنگ ہوتا اور ان کا ہر فعل صدق و دیانت اور تقویٰ و طہارت سے عبارت ہوتا تھا۔ ان کی پوری زندگی نیکی اور پارسائی کے سانچے میں ڈھل چکی تھی۔ زندگی میں شاید ہی کبھی پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہو۔ ہمیشہ موٹا اناج کھاتی تھیں۔ گاڑھا پہنتیں اور کھال اوڑھ کر گزارہ کرتی تھیں حالانکہ ان کے عقیدت مند انہیں بہترین کھانے اور ملبوسات پیش کرتے مگر وہ سب غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیتی تھیں۔ اس قسم کی بے ریا اور بے لوث زندگی نے انہیں ولایت کے رتبے تک پہنچا دیا۔ بڑے بڑے صوفیاء اور اولیائے کرام ان سے متاثر تھے کیونکہ وہ تصوف کی حقیقت اور اس کے اسرار و رموز سے بخوبی آگاہ تھیں۔ اور عملی زندگی بسر کرتی تھیں۔ اپنے وقت کے دو بہت بڑے اولیائے کرام ان سے متاثر تھے کیونکہ وہ

معرفت کی حقیقت اور اس کے اسرار و رموز سے بخوبی آگاہ تھیں اور عملی زندگی بسر کرتی تھیں اپنے وقت کے دو بہت بڑے اولیائے کرام حضرت ذوالنون مصریؒ اور بایزید بسطامیؒ ان کے شاگرد تھے اور ہمیشہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ انہوں نے فاطمہ نیشاپوری سے فیض حاصل کیا ہے۔ حضرت شیخ بایزید بسطامی قدس سرہٗ نے فاطمہؒ کی بے حد تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں ایک مرد اور ایک عورت دیکھی۔ عورتوں میں جس عورت کو میں نے صاحبِ کمال اور عارفہ پایا وہ فاطمہ نیشاپوریؒ ہیں۔ کسی مقام پر کوئی خبر ہو وہ آپ پر منکشف ہو جاتی ہے ایک اور موقعہ پر آپ نے فرمایا کہ میری استاد فاطمہ نیشاپوری فرمایا کرتی تھیں کہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کا انہیں علم نہیں۔ مشائخ میں سے کسی نے حضرت ذوالنون مصریؒ کو دیکھ کر پوچھا کہ سب سے زیادہ بزرگ کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ مکہ میں ایک عورت فاطمہ نیشاپوری ہے جو بزرگ ترین ہے۔ وہ قرآن مجید کے ایسے ایسے حقائق و معانی بیان کرتی ہیں کہ مجھے ان پر رشک آتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ سے یہ روایت بھی منسوب ہے کہ آپ نے فاطمہؒ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا میں کوئی صوفی آپ سے زیادہ بزرگ نہیں جو درمیان میں سبب اور واسطہ پر نظر نہ رکھتا ہو۔ فاطمہ نیشاپوریؒ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ حکمت و عرفان اور معرفتِ الٰہی کا سمندر تھیں۔ ان کے اقوال و بیانات میں زندگی کے بڑے بڑے حقائق پوشیدہ ہیں۔ ایک دفعہ فرمایا کہ جو کوئی محض اللہ کے لیئے اس طرح نیک عمل کرے گویا خدا اسے دیکھ رہا ہے تو اس سے زیادہ خلوص کسی میں نہیں ہو سکتا اور جس کے نیک عمل میں خلوص ہو اس سے زیادہ خدا کا نیک بندہ اور کون ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ حضرت ذوالنون مصریؒ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص اس طرح نہیں رہتا کہ اللہ سے اس کی لو لگی رہے، وہ ہر میدان میں اڑتا پھرتا ہے اور ہر قسم کی باتیں کرتا ہے۔ اس سے نیک کام بہت کم اور گناہ بہت زیادہ سرزد ہوتے ہیں

لیکن جو ہر حال میں خدا سے لو لگائے رکھتا ہے تو اللہ تعالےٰ صدق و صداقت کے سوا باقی تمام باتوں سے اسے گونگا کر دیتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ انسان خدا سے شرم رکھے اور ہر وقت دلی خلوص کے ساتھ اس کی طرف متوجہ رہے۔ ایسے شخص سے بہت زیادہ نیک کام انجام پاتے ہیں بلکہ گناہ سرزد ہی نہیں ہوتا۔

حضرت فاطمہؒ نیشاپوری سے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے بے شمار پاپیادہ حج کئے اور ہر منزل پر لوگوں کو نیکی کے راستے پر چلنے کی تلقین کرتی رہتی تھیں۔ حجاز کے علمائے وقت اور خانہ کعبہ کے بزرگانِ دین ان کے ساتھ بے حد عزت و احترام کے ساتھ پیش آتے تھے اور ان سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جب آخری مرتبہ حج کے لئے تشریف لے گئیں تو یہ خیال ظاہر کیا کہ شاید یہ ان کا آخری حج ہو۔ ان کا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ ۲۲۳ھ میں وہیں وفات پائی۔ بعض تذکرہ نویسوں کی روایات کے مطابق مکہ معظمہ کے قریب کسی مقام پر داعی اجل کو لبیک کہا اور دربارِ حبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک خاک ابدی آرام و سکون کے لئے نصیب ہوئی۔

حضرتِ فاطمہ نیشاپوریؒ کی پاک اور صوفیانہ زندگی کا یہ پہلو خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ ان کے نزدیک نفر و تصوّف کی بنیادی اور اولین شرط زہد و عبادت تھی۔ انہوں نے تادمِ آخر نماز کی پابندی فرمائی اور زیادہ سے زیادہ مرتبہ فریضۂ حج ادا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مجذوب بن کر حدودِ الٰہی کو توڑنے اور شعائرِ اسلامی سے روگردانی کرنے کو کبھی تصوف نہیں سمجھا بلکہ تزکیۂ نفس اور روحانی بلندیوں تک پہنچنے کے لئے انہوں نے اتنی کثرت سے عبادت کی کہ ہم میں سے کوئی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ان کی زندگی ہمیں سکھاتی ہے کہ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی۔ دنیا کی ہر مسلمان عورت نیک اعمال کی بدولت بلند ترین مقامات حاصل کر سکتی ہے اور قرطاسِ ہستی پر غیر فانی حروف میں اپنا نام کندہ کر سکتی ہے

ان کی زندگی کا یہ رخ بھی ہر لحاظ سے قابل تقلید ہے کہ جب ایک مسلمان عورت کا دامنِ حیات اللہ سے وابستہ ہو جاتا ہے اور اس کا دل انوار معرفت سے سراپا نور بن جاتا ہے تو وہ سب سے پہلے خود اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کر کے دوسروں کے لئے ایک بے مثال نمونہ بنتی ہے اور پھر ہر لحظہ دوسروں کو نیکی کی تلقین کرنا، انہیں علم و فضل کے زیور سے آراستہ کرنا اور صراط مستقیم پر چلانا اس کا مقصدِ زندگی بن جاتا ہے۔ وہ صرف اللہ کے لئے جیتی اور اللہ کے لئے جان دیتی ہے۔

فاطمہ نیشاپوریؒ کا یہ پیغام کہ نیک اعمال کی بنیاد ہمیشہ خلوص پر رکھو اور صدق و دیانت کو اپنا شعار بناؤ — ہر مسلمان عورت کے لئے اوج و کمال کی طرف آنے کی دعوت ہے، جس نے اس پیغام کو دل سے سمجھ کر حرزِ جاں بنالیا وہ ایک ناقابلِ تسخیر طاقت بن سکتی ہے۔

[illegible]

حضرت آمنہ رملیہؒ

"اگر اللہ تعالیٰ نے رزق دینے کی ذمہ داری خود لی ہے تو تیری فکرمندی کیوں؟ اگر ہر چیز کے بعد دوسری اس کی جگہ لے لیتی ہے تو بخل کیسا؟ اگر جنت حق ہے تو خوشی کیوں؟ اور اگر دوزخ سچ ہے تو گناہ کیوں؟ اگر ہر چیز قضاؤ قدر کی گرفت میں ہے تو پھر ڈر کس کا؟

(آمنہ رملیہ؟)

آمنہ رملیہؒ

آمنہ نام تھا۔ تقریباً ۱۹۳ھ میں بغداد کے ایک نواحی علاقے رملہ میں پیدا ہوئیں۔ والدین بے حد غریب تھے۔ گھر میں ہر وقت فقر و فاقہ کی حالت رہتی تھی۔ طبیعت بچپن ہی سے قدرتی طور پر حصولِ علم کی طرف راغب تھی۔ بے حد ذہین، روشن دماغ اور عقل مند تھیں۔ سن شعور کو پہنچیں تو اپنی والدہ کے ساتھ فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئیں۔ اس زمانے میں مکہ علم و حکمت اور رشد و ہدایت کا سرچشمہ بنا ہوا تھا۔ ایک بزرگ عالم ان دنوں مسجدِ حرام میں درس دیا کرتے تھے۔ آپ حصولِ علم کی خاطر ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئیں۔ اور بڑے ذوق و شوق کے ساتھ تحصیلِ علم میں مصروف ہو گئیں۔ عرصہ دراز تک مکہ معظمہ میں مقیم رہیں اور اس دوران بڑی محنت اور جستجو سے قرآن کا علم حاصل کیا۔ جب ان کے استاد انتقال فرما گئے تو حضرت امام مالکؒ سے علم حدیث سیکھنے کے لئے مدینہ منورہ آ گئیں۔ حضرت امام مالکؒ کی صحبت میں رہ کر ان کی صلاحیتیں خوب اجاگر ہو گئیں اور انہوں نے والہانہ ذوق و شوق کے ساتھ علم حدیث پر پورا عبور حاصل کیا۔ انہیں بے شمار احادیث زبانی یاد تھیں۔ ۱۹۹ھ کے قریب علم فقہ حاصل کرنے کے لئے حضرت امام شافعیؒ کی خدمت میں دوبارہ مکہ معظمہ تشریف لائیں۔ اس طرح آپ نے اس دور کے دو جلیل القدر آئمہ کرام کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف حاصل کیا۔ جب حضرت امام شافعیؒ مصر تشریف لے گئے تو آپ کوفہ آ گئیں

اور شرعی علوم کے بلند پایہ ماہرین اور فقہاء سے فیض حاصل کیا۔ عرصۂ دراز کی علمی ریاضت اور سخت محنت کے بعد مراجعت فرمائے وطن ہوئیں تو علوم دین میں آپ کو قابلِ رشک مرتبہ حاصل ہو چکا تھا۔ چاروں طرف آپ کے علم و فضل کی دھوم مچ گئی۔ اور لوگ جوق درجوق علمی تشنگی بجھانے کے لیے آپ کے آستانۂ حکمت پر حاضر ہونے لگے۔ بغداد کے بے شمار لوگ جن میں علماء بھی شامل ہوتے تھے آپ کے حلقۂ درس میں آنا فخر و سعادت سمجھتے تھے کہا جاتا ہے کہ اس وقت مردوں میں بھی بہت کم لوگ علم و فضل کے میدان میں آپ کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ بڑے بڑے علماء، صوفیاء اور فضلاء آپ کی علمی قابلیت اور ذہانت کے دل سے معترف تھے۔ ۲۰۹ھ میں ایک درویش کامل نے آپ کی طرف توجہ فرمائی تو ان کی روحانی تعلیم نے آمنہ رملیہؒ کے تمام ظاہری علوم کو علم باطن میں تبدیل کر دیا جس سے ان کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہوا۔ ان کا علمی کبر و غرور اور احساس برتری دیکھتے ہی دیکھتے عجز و انکساری اور خاکساری کے سانچے میں ڈھل گیا علمی نکتہ آفرینی اور فلسفیانہ اندازِ فکر کا دور بالکل ختم ہو چکا تھا۔ صبح و شام ذکر الٰہی اور عبادت میں مصروف رہتی تھیں۔ اللہ کی تسبیح و تحمید اور گریہ و زاری ان کا معمول بن گیا۔ اپنا تمام مال و اسباب راہِ خدا میں تقسیم کر دیا اور بالکل فقیرانہ زندگی اختیار کر لی۔ روزہ و نماز اور ذکر و فکر کے علاوہ کسی دوسری چیز سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ سات حج پاپیادہ کیئے۔ اس وقت کے ایک بہت بڑے بزرگ حضرت بشرؒ ان کے بے حد مداح تھے۔

ایک مرتبہ آمنہؒ نے حضرت بشر سے کہا کہ اے بشر! میں سوتی ہوں مگر دل جاگتا ہے۔ حضرت بشرؒ فرماتے ہیں کہ وہ ساری ساری رات انتہائی خشوع و خضوع سے اس طرح عبادت کرتی تھیں کہ صبح تک دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر رہتی تھیں

ایک دفعہ کسی رئیس نے بے حد اصرار کے ساتھ دس ہزار اشرفیاں قبول کرنے کے لئے بہت زیادہ مجبور کیا تو آپ نے اس کو چھونا تک گوارا نہ کیا بلکہ شہر میں منادی کرادی کہ جس کو روپے کی ضرورت ہو آ جائے چنانچہ شام تک ان کے پاس ایک کوڑی باقی نہ رہی حالانکہ اس روز ان کے گھر میں فاقہ تھا۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ ایسے جلیل القدر اور بلند مرتبت امام جن کے زہد و تقویٰ کے خود امام شافعیؒ معترف تھے آمنہ رملیہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت بشرؒ کے توسط سے یہ خواہش ظاہر فرمائی کہ آمنہ رملیہ ان کے لئے دعا کریں۔ صحیح تاریخ وفات کا علم نہیں ہے۔

حضرت آمنہ رملیہؒ کی زندگی میں مسلمان خواتین کے لئے کتنا بڑا سبق پوشیدہ ہے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ مختلف ممالک اور دنیا کے دور دراز شہروں میں آنے جانے کے موجودہ تیز رفتار ذرائع موجود نہ تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک سفر بے حد پرخطر، دہشت ناک اور کٹھن ہوتا تھا۔ اخبارات کا رواج نہ تھا، چھاپہ خانے نہ تھے۔ موجودہ طرز کے بڑے بڑے اسکول اور کالج عام نہ تھے آسانی کے ساتھ کتابیں دستیاب نہ ہوتی تھیں اور پھر انہیں پڑھانے والوں سے تعلق پیدا کرنا بھی آسان نہ تھا۔ ان تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسی غریب اور مفلس لڑکی کا تصور کیجئے جسے پیٹ بھرنے کے لئے دو وقت کا کھانا بھی میسر نہ ہو۔ اس نے دیہاتی ماحول میں پرورش پائی ہو اور وہ دنیا کے نشیب و فراز سے بالکل ناواقف ہو۔ اللہ کے سوا دنیا میں کوئی اس کا حامی اور مددگار نہ ہو۔ کوئی اس کی سفارش کرنے والا اور راہنمائی کرنے والا نہ ہو۔ اسے کسی طرف سے نہ کوئی وظیفہ ملتا ہو اور نہ کسی قسم کی دوسری مالی امداد حاصل ہو۔ ان حالات میں ایک سیدھی سادی الھڑ دیہاتی لڑکی دل میں تحصیل علم و حکمت کی آرزو لئے چیتھڑوں میں لپٹی

اپنی غریب اور مفلس ماں کی معیت میں فریضہ حج ادا کرنے کے لئے جاتی ہے۔ سفر کی بے پناہ صعوبتیں برداشت کرتی ہے اور تمام دنیوی اسباب آسائش سے محروم ہونے کے باعث کئی مصائب برداشت کرنے کے بعد دیار حبیب میں پہنچ جاتی ہے۔ زیارات حج سے فراغت پانے کے بعد لاکھوں انسانوں میں اس کی کھوئی کھوئی آنکھیں کسی صاحب علم کو تلاش کرتی ہیں۔ آخر اس کی امید بر آتی ہے اور اسے ایک بہت بڑے بزرگ کے حلقہ درس میں شامل ہو کر علم قرآن سیکھنے کا موقع مل جاتا ہے جوں جوں اس کا علم بڑھتا جاتا ہے، حصول علم کا شوق بھی اسی رفتار سے فراواں ہوتا جاتا ہے۔ وہ مکہ و مدینہ کے حکمت کدوں کی خاک چھانتی پھرتی ہے۔ برسوں کی تلاش و جستجو اور محنت و ریاضت کے بعد وہ تمام دینی علوم پر حیرت انگیز حد تک عبور حاصل کر لیتی ہے۔ ایسے ایسے کامل اور بلند مرتبت اساتذہ کی صحبت نصیب ہوتی ہے جو منصب امامت پر فائز تھے اور دنیائے اسلام میں احترام و عقیدت کے مراکز خیال کئے جاتے تھے۔ بڑے بڑے اراکین سلطنت بلکہ خلفاء تک ان کی خدمت میں باریابی حاصل کرنا اپنے لئے باعث فخر و سعادت خیال کرتے تھے۔ ایسے بزرگوں کی خدمت میں رہ کر اس نے برسوں علوم حاصل کئے اور اپنی علمی پیاس بجھائی۔ آخر وہ اس رتبے کو پہنچی کہ خود کبار علمائے کرام اس کے حلقہ درس میں شامل ہونا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اور وہ دلدادگان علم و حکمت کیلئے ایک سرچشمہ ہدایت بن گئی۔

یہی مفلس اور قلاش لڑکی آمنہ زکیہ تھی جس نے ایک کمزور اور ناتوان اور بے سہارا عورت ہونے کے باوجود چین تک جا کر علم حاصل کرنے کے ارشاد نبوی کو کس شان سے عملی جامہ پہنایا۔

کیا یہ اسلامی تعلیم کا اعجاز نہیں کہ ایک بے یار و مددگار دیہاتی لڑکی اپنی ذاتی

کوشش اور کاوش سے علمی فضیلت کی آخری حد تک جا پہنچی کون کہتا ہے کہ اسلام تعلیم نسواں کا دشمن ہے؟ تاریخ گواہ ہے —— یہ وہ دور تھا جب یورپ کی عورتوں کا تو ذکر ہی کیا ان کے بڑے بڑے مذہبی راہنما اور پادری نوشت و خواند تک کی صلاحیت سے محروم تھے ان کے نزدیک علم اور جادو ہم معنی الفاظ تھے کیا پورا یورپ اس دور کی ایک بھی عورت کو حضرت رابعہ بصریؒ۔ فاطمہ نیشاپوریؒ اور آمنہ رملیہؒ کے مقابلے میں پیش کر سکتا ہے؟ اس وقت کسی عیسائی عورت کو یہ اجازت نہ تھی کہ کتابِ مقدس کو چھونے تک کی کوشش کر سکے۔ مذہبی راہنمائی کا شرف تو اسے آجتک بھی نصیب نہیں ہو سکا۔

پورا یورپ اس نظریہ کا قائل تھا کہ عورت بدی کی جڑ ہے اور نجس ہے۔ اس لئے وہ انجیل کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ اس وقت امتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن آمنہ رملیہؒ ایسی بلند پایہ ہستیوں کے علم و حکمت کا سدا بہار گلستان بن کر پوری دنیا کو نور و نکہت کی دولت بخش رہا تھا۔ اس وقت مسلمان عورت قرآن کی حافظہ تھی، قاریہ تھی، مفسّرہ تھی۔ محدّثہ اور فقیہہ تھی۔ علومِ شریعت اور علومِ عصریہ کی عالمہ اور فاضلہ تھی —— بڑے بڑے علماء ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے۔ ان کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ جلیل القدر بزرگ اولیاء اور آئمہ کرام ان سے فیضیاب ہونا باعثِ سعادت خیال کرتے تھے۔ وہ مسلمان خواتین خود ایک مکتب اور یونیورسٹی تھیں۔ ہزاروں لوگ ان کے علم و فضل سے بہرہ ور ہوتے تھے اکثر وہ جو مردوں کے استاد، معلّم، راہنما اور امام تھے ان کی استادی اور راہنمائی کا شرف ان بلند کردار عورتوں کو حاصل تھا۔

اندھی تقلید کا روگ آج کس طرح ہمارے شاندار ماضی کو برباد کر رہا ہے

کاش! ہماری مسلمان بہنیں اپنی تاریخ کے اوراق پارینہ میں اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو تلاش کرنے کے قابل ہو سکیں اور مسلمان عورت کے شرف کو عرشِ اعظم کے سامنے سجدہ ریز دیکھ سکیں۔

مغیرہ بنت ازور

جس کی عصمت و عفت اور غیرت نے نشۂ اقتدار
میں مست شہنشاہی کو غریب الوطنی اور بے کسی کے
عالم میں للکارا — جس نے سنسان جنگل کی تنہائی
میں مسلمان عورت کے بلند کردار کی قندیل قیامت
تک کے لئے روشن کر دی اور مستقبل کی عورت کے
لئے ایک تابندہ و درخشندہ مثال قائم کر دی —

مغیرہ بنت ازور

خاندانِ بنو عباس کی حشمت و صولت اور عظمت و شوکت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ خلیفہ مامون الرشید کے سر پر تاج شہنشاہی جگمگا رہا تھا۔ وہ ایک طرف بلادِ اسلامیہ کا روحانی پیشوا سمجھا جاتا تھا تو دوسری طرف ایک رفیع الشان، پر ہیبت اور پرجلال سلطنت کا تنہا حکمران تھا۔ اس وقت یہ دنیا کی سب سے بڑی اور عظیم الشان سلطنت ترقی و کمال کے لحاظ سے اوجِ ثریا کو سر سار کر رہی تھی۔ مامون الرشید کا بڑا لڑکا اور ولی عہد شہزادہ عباس طائفۃ الخل میں شکار کھیلتا ہوا ایک نواحی جنگل کے قریب جا نکلا۔ شام کے جھٹپٹے میں اس نے دیکھا کہ ایک حسین و جمیل عورت چشمے پر پانی کی گاگر بھر رہی ہے۔ شام کے بلکے اندھیرے میں آفتاب کو شرما دینے والی ایک عورت اس ویران و سنسان جنگل میں شہزادہ عباس کے لیئے ایک عجوبہ سے کم نہ تھی۔ وہ شاہی رعب و داب اور تمکنت کے ساتھ اس عورت کے قریب پہنچا اور جاتے ہی انتہائی بے باک لہجے میں پوچھا کہ اے حسین عورت! تو کون ہے، کس خاندان سے ہے اور ایسے غیر آباد مقام پر جہاں جنگل اور پہاڑ کے سوا کچھ نہیں تو تنہا کیا کر رہی ہے؟ یہ غیر متوقع اور بے ہودہ سوال سن کر اس غیور اور باحیا خاتون کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ اس نے حقارت بھری نظروں سے شہزادہ عباس کی طرف دیکھا اور جواب دیئے بغیر بڑی خودداری کے ساتھ چل دی یہ تو شاہی تمکنت اور خاندانی فخر و غرور کے منہ پر زبردست طمانچہ تھا۔ ولی عہد سلطنت

اور ہونے والے خلیفہ کے لئے اس سے بڑی توہین اور کیا ہو سکتی تھی۔ ایک معمولی بیابانی عورت نے نوجوان شہزادے کی بات کا جواب دینا بھی اپنے لئے کسرِ شان خیال کیا۔ شہزادہ عباس، دفورِ غضب سے دیوانہ ہو گیا۔ حکم دیا کہ اس مغرور عورت کا حسب نسب دریافت کرو۔ اور اسے ولی عہد کی جانب سے نکاح کا پیغام دو۔ فوجی افسران اور محافظ سپاہی فوراً اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔ شکار ملتوی کر دیا گیا کیونکہ ایک بے حیثیت انجان عورت نے شاہی غرور و نخوت کے سر میں خاک ڈال دی تھی۔ شہزادہ اپنے خیمے میں واپس جا کر خاموشی سے لیٹ گیا۔ نشۂ اقتدار اور شاہی نخوت کا غرور اور دوسری طرف جوانی کی سرمستی ـــ اس کے لئے یہ بالکل ایک نیا تجربہ تھا کہ شہزادہ اس دبدبہ و ہیبت کے مظاہرے کے ساتھ ایک معمولی عورت کو اپنی بات کا جواب دینے پر آمادہ نہ کر سکا۔ عباس رات بھر۔ انتہائی پریشانی کے عالم میں کبھی خیمے کے اندر اور کبھی خیمے سے باہر بے تابی سے ٹہلتا رہا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس مغرور عورت سے اپنی شکست کا انتقام لئے بغیر واپس نہ جائے گا شاہی وقار مجروح ہوا تھا۔ اس کی پریشانی اور بے تابی ہر لحاظ سے قابلِ فہم تھی۔ خدام اور سپاہی تلاش و جستجو کے بعد واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ وہ حسین و جمیل عورت جس کی نفرت و حقارت سے بھرپور نگاہوں نے شاہزادے کو اپنی نظروں سے بھی گرا دیا تھا۔ خاندانِ برامکہ کی لڑکی مغیرہ ہے اور انور رکی بیٹی ہے۔ اس کے شوہر کا نام حسین بن مرسلے تھا جو قتل ہو چکا ہے اور وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ وارثوں میں اس وقت کوئی بھی زندہ نہیں۔ وہ شہزادہ عباس کی طرف سے نکاح کا پیغام سنتے ہی آگ بگولا ہو گئی اور اس نے انتہائی غضب ناک آواز میں شہزادے کے پیغام کا یہ جواب دیا ہے۔

ہارون الرشید ہمیں ملیامیٹ کر چکا ہے اور ہمیں قتل و غارتگری کا

شکار بنا چکا ہے۔ اب مامون الرشید ہماری عزت و ناموس اور
عصمت و عفت کے درپے ہے۔ جاؤ! اور عباس کو کہہ دو
کہ اگر اس نے میری جھونپڑی کے اندر قدم رکھنے کی جرأت کی تو اسی
دہلیز کے نیچے اس کا مدفن بنے گا۔

شہزادہ عباس یہ جواب سن کر ایک لمحے کے لئے سکتے میں آ گیا پھر اچانک اس کی آنکھوں سے غیظ و غضب کے شعلے نکلنے لگے۔ اس کا جسم وفورِ غضب سے کانپ کانپ گیا کیونکہ ایک بے سر و سامان اور بے یار و مددگار عورت نے پورے خاندانِ عباسیہ کی عظمت و شوکت کو للکارا تھا۔ شہزادے نے اسی وقت اپنے آدمیوں کو عتابِ شاہی کی اطلاع دینے کے لئے روانہ کر دیا۔

منیرہ بھی رات بھر سو نہ سکی تھی۔ اسے علم تھا کہ طلوع ہونے والی صبح کا سورج شاید اس کی بے گور و کفن لاش کے سوا کچھ نہ دیکھ سکے گا۔ اس نے انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ نمازِ فجر ادا کی۔ اور اللہ کے حضور میں گڑگڑا کر اپنی عفت و عصمت کی حفاظت کے لئے دعا مانگی۔ نماز اور دعا سے فارغ ہو کر اس نے اپنے دونوں معصوم بچوں کو سینے سے لپٹا کر خوب پیار کیا۔ اور کہا میرے بچو! اس جنگل میں اللہ کے سوا تمہارا کوئی حامی و ناصر نہیں ہے۔

اتنے میں شہزادہ عباس کے سپاہیوں نے دستک دی اور یہ پیغام دیا کہ شہزادہ عباس نے حکم دیا ہے کہ اس کا غصہ تیرے غرور کو خاک میں ملا دے گا۔ اس کے غضب کی آگ تیرے جان و مال کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔ شہزادے کے حکم سے یہ مکان ضبط کیا جاتا ہے اور تجھے دو گھنٹے کی مہلت دی جاتی ہے کہ اس مکان کو خالی کر دے۔ منیرہ یہ پیغام سن کر دروازے پر آئی اور ان سے کہا۔ عباس [redacted] وقت بھول جائے جب میرے بڑے دادا کا سر ہارون الرشید کے سامنے رکھا گیا اور اس خونِ ناحق

کے بعد اس نے خاندانِ برامکہ کو اناج کے ایک ایک دانے کے لئے محتاج کر دیا تھا مگر میری دادی ماں اور بہنیں جس طرح ان مظالم کو برداشت کرتی رہی ہیں اس کی داستان ابھی خاندانِ بنو عباس نے فراموش نہیں کی ہو گی ــــ اگر آج وہ پھر ہمارے صبر و استقلال اور تحمل کا امتحان لینے پر مامور ہوا ہے تو کوئی بات نہیں۔ وہ اپنا شوق پورا کر سکتا ہے میں اپنا فرض ادا کر دوں گی۔ یہ کہہ کر مغیرہ نے ایک معمولی سی چادر اوڑھی اور اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔ شہزادہ عباس جبر و تشدد کے ذریعہ اس کا التفات حاصل نہ کر سکا۔ اور بے نیلِ و مرام واپس آ گیا۔ اس کے بعد عرصہ دراز تک کسی کو مغیرہ بنت ازدر کی کوئی خبر معلوم نہ ہوئی۔

دوسری صدی ہجری ختم ہونے والی تھی۔ مامون الرشید معمول کے مطابق اپنا دربار سجائے امورِ سلطنت میں مصروف تھا۔ امرائے سلطنت اور وزرائے دربار حسب مراتب بیٹھے تھے۔ سلطنت کا ولی عہد شہزادہ عباس خلیفہ کے پہلو میں متمکن تھا کہ ایک عمر رسیدہ عورت دربار میں فریادی بن کر داخل ہوئی۔ مامون نے اسے طلب کیا اور پوچھا کہ کیا چاہتی ہو؟ اس عورت نے انتہائی خشمناک لہجے میں کہا کہ ایک بیوہ عورت کا مکان صرف اس لئے ضبط کیا جا چکا ہے کہ وہ اپنی عصمت و آبرو کی محافظ تھی۔ خاندانِ بنو عباس کو یہ ظلم مبارک ہو۔ مگر مامون الرشید! یاد رکھو ایک روز اس شہنشاہ کے حضور بھی پیش ہونا پڑے گا جس کی سلطنت کبھی فنا نہیں ہوتی ــــ امیر المومنین! میں ایک ظالم کے خلاف فریاد لائی ہوں اور آج اس بھرے دربار میں انصاف چاہتی ہوں۔ مامون الرشید کے دربار میں جہاں ہر شخص دم سادھے بیٹھا تھا۔ کسی میں ہونٹ ہلانے کی جرأت نہ تھی۔ اس نامعلوم عورت کی بے باکی اور بے خوفی دیکھ کر سب اس کا منہ تکنے لگے۔

مامون الرشید نے کہا کہ ظالم کا نام بتاؤ ــــ وہ کون ہے ہم انصاف کرینگے

یہ سن کر عورت ہنسنے لگی اور کہا ظالم ـــــ آپ کے پہلو میں بیٹھا ہے۔ میں شہزادہ عباس کے خلاف فریاد لے کر آئی ہوں، جو اس وقت آپ کے تختِ شہنشاہی پر متمکن ہے۔ مامون الرشید کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ اس نے چوب دار کو حکم دیا کہ عباس کو اس عورت کے برابر کھڑا کر دو تاکہ دونوں میں امتیاز باقی نہ رہے۔ اس کے بعد مامون نے اس پر جرح شروع کی تو وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکا بلکہ ہر سوال کے جواب میں رک رک کر کوئی ادھوری سی بات کہہ دیتا تھا۔ مغیرہ بنت ازور نے بڑی جرأت کے ساتھ تمام واقعہ بیان کیا۔ اس کے بارعب چہرے سے عظمت اور غیرت ٹپک رہی تھی۔ مغیرہ نے عباس کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

عباس! یہ درست ہے کہ تو مامون الرشید کا بیٹا ہے اور ملک و سلطنت کا مالک بننے والا ہے، لیکن یہ کمزور ہاتھ اس وقت کے منتظر تھے۔ جب تو اپنی دھن میں بے خود اور بے قابو ہو کر ایک قدم بھی آگے بڑھتا تو تیری لاش خاک و خون میں تڑپتی نظر آتی۔ آلِ برامکہ اور ان کی دولت و عزت کو عباسیوں نے پامال کر دیا مگر ہماری عصمت وہ دولت ہے کہ ہم عباسی سلطنت کو بھی اس پر قربان کر سکتی ہیں۔ وزیرِ دربار نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا کہ ادب سے گفتگو کرو۔ یہ بے باک گفتگو آدابِ شاہی کے خلاف ہے مگر مامون الرشید نے کہا کہ اس کو مت روکو۔ یہ حق رکھتی ہے کہ جو اس کے منہ میں آئے کہے۔ یہ اس عورت کی صداقت ہے جس نے اس کے حوصلے کو بلند کر دیا ہے اور اس کی گفتگو کو بے باکی عطا کی ہے اور دوسری طرف عباس کی کمزوری ہے جس نے اس کی زبان گنگ کر دی ہے۔

اسی وقت مامون الرشید نے خود تختِ شاہی سے اتر کر اشرفیوں کی پانچ تھیلیاں اس کے قدموں میں ڈال دیں۔ نہ صرف اس کا وہ جنگل کا جھونپڑا نما مکان واپس کیا بلکہ

قصرِ عباس جو ایک عظیم الشان محل تھا، مغیرہ کو عطا کیا اور لجاجت سے درخواست کی کہ
عباس کا قصور معاف کر دے — یاد رہے کہ مغیرہ بنت ازوز برمکیوں کے اسی خاندان
سے تھی جو ہارون الرشید کے عہد حکومت میں سلطنت کے سیاہ و سپید کا مالک تھا، مگر
جب ان پر خلیفہ کا عتاب نازل ہوا تو ہارون نے پورے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا۔
مغیرہ کی اخلاقی عظمت، جرأت و بسالت اور عصمت پرستی میں ایک سچی مسلمان
عورت کا کردار جھلک رہا تھا۔

فخر النساء

شهده بنت ابونصر احمد

کمالِ فن کا مکمل نمونہ، علوم و فنون کا مجسمہ —
فنِ تدریس میں بے نظیر فنِ کتابت اور خوشنویسی
میں یکتائے روزگار۔ بہترین مقررہ۔ اور صاحبۂ
فضیلت تھیں۔ ہزاروں طلبہ اُن کے خرچ پر
زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہوئے —

شہدہ بنت ابونصر احمد

شہدہ ۴۸۲ھ میں شہر دینور میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام ابونصر احمد تھا جو اپنے دور کے زبردست عالم اور ممتاز شخصیت تھے۔ فخر النساء کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ آپ کے والد کو عباسی خلیفہ نے ان کے علم و فضل کی شہرت سن کر دینور سے بغداد بلا لیا۔ اور اپنے شاہی ملازمین میں شامل کر لیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی شہدہ نے ایک ایسے پاکیزہ علمی ماحول میں آنکھ کھولی جہاں رات دن علوم و فنون کے چرچے رہتے تھے۔ ہر وقت اصحاب علم و فضل کی آمد و رفت رہتی تھی۔ اور گھر میں عموماً علمی مسائل کا تذکرہ جاری رہتا تھا۔ شہدہ بچپن ہی سے بہت ذہین، ہوشیار اور عقل مند تھیں۔ کچھ گھر کا ماحول اور کچھ شہدہ کا شوق، بہت جلد علمی مشاغل میں دلچسپی لینے لگیں۔ باپ نے انہیں حدیث اور فقہ کی تعلیم بڑی محنت کے ساتھ دی۔ شہدہ نے فن کتابت بھی اپنے باپ سے سیکھا اور بہت جلد خوشنویسی اور خطاطی میں اتنی ماہر ہو گئیں کہ شہر کے کئی خوشنویس ان سے اصلاح لینے کے لئے آتے تھے۔ آپ کا خط اس قدر پاکیزہ اور خوبصورت تھا کہ دیکھنے والا حروف کے دائروں اور نکتوں وغیرہ کے اعجاز میں گم ہو کر رہ جاتا تھا۔ اپنے اس کمال فن کی بدولت وہ لوگوں میں شہدہ کاتبہ کے نام سے مشہور ہو گئیں۔ ان کے حسن تحریر میں ایک جادو پنہاں تھا جس سے ان کے فنی ذوق کی لطافت، بلندی اور سیرت کی خوب صورتی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ مشہور ہے کہ جس کی تحریر میں خوب صورتی ہو اس کی سیرت میں بھی کوئی نہ کوئی

حسن ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔ شہدہ کے اساتذہ میں ابوالخطاب نصر بن احمد، ابو عبداللہ حسن بن احمد نعمانی، ابوالحسینی، احمد بن عبدالقادر بن یوسف اور ابو بکر محمد بن احمد شاشی کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ ان لائق اور یگانۂ روزگار اساتذہ کے فیضِ صحبت نے انہیں علوم و فنون کے سانچے میں ڈھال دیا۔ وہ اپنے وقت کی بہترین مقررہ، عالمہ اور فاضلہ بن گئیں اور اپنے باپ کی صحیح جانشین ثابت ہوئیں۔ شاہی ملازمت کے بعد ان کے والد بہت خوش حال اور فارغ البال ہو گئے تھے اور دارالسلطنت کے تمام حلقوں میں بہت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ دولت مند تھے، رؤسائے سلطنت میں شمار ہوتے تھے۔ عزت و شہرت بھی شاہی دربار میں لائقِ تعظیم خیال کئے جاتے تھے وہ اگر چاہتے تو اپنی قابلِ فخر اور پیکرِ علم و فضل بیٹی کو کسی بہت اونچے گھرانے میں بیاہ سکتے تھے جب کہ شہدہ نے سنِ بلوغ تک پہنچتے ہی کمالِ فن اور علمی لیاقت میں بہت شہرت حاصل کر لی تھی۔ ملک کے رؤسا اور شہزادے تک ان سے وابستہ ہونا باعثِ فخر سمجھتے تھے مگر شادی کے معاملے میں نہ شہدہ نے خود یہ تاجرانہ انداز پسند کیا اور نہ ان کے فاضل باپ نے کسی سیاسی یا خاندانی مصلحت کی قربان گاہ پر اپنی ہونہار بیٹی کو بھینٹ چڑھانا گوارا کیا۔ شہدہ کے باپ نے علم و فضل کی اس شہزادی کے لئے اپنے غریب شاگردوں میں سے ایک لائق اور نیک سیرت شخص علی بن محمد کو شادی کے لئے منتخب کیا۔ رؤسائے دربار اور شہزادے شہدہ کو سیم و زر کے انبار تو دے سکتے تھے اس قسم کے دنیوی اسباب آسائش و راحت تو مہیا کر سکتے تھے بلکہ اسے ہیروں اور جواہرات میں تول کر بھی لے سکتے تھے مگر وہ شہدہ کے لئے ہوس پرست جہلاء سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ وہ شہدہ کو نہیں اس کے پر شباب حسن و جمال اور اس کے شرف و فضیلت کو اپنی سماجی برتری کے لئے خرید کر اپنے لئے ذریعہ کبر و نخوت بنانے

کے سوا اور کیا قدردانی کر سکتے تھے۔ وہ شان و شوکت اور فخر و تفاخر کے سوداگر ضرور تھے۔ مگر ذوقِ بلند اور علم و فضل کی گہرائیوں سے بسائی ہوئی جنت میں رہنے کے قابل نہ تھے۔ چونکہ شہدہ کے والد خود بہت بڑی عالمانہ شخصیت کے مالک تھے اور اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ گنجِ حکمت و فن کا وارث ان شوکت پرست دنیاداروں اور بوالہوس قسم کے لوگوں سے کہیں زیادہ ممتاز، لائقِ احترام اور انمول حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا بھی ایک غیر فانی سلطنت کا تاجدار ہوتا ہے جس کی عظمت و رفعت کے سامنے ان کی حیثیت کیڑوں کوڑوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ جانتے تھے کہ دولت ہر کس و ناکس کے پاس جمع ہو سکتی ہے۔ دنیوی شوکت اور اعزاز، خوشامد، چاپلوسی، فریب کاری اور ظلم و عدوان سے بھی حاصل ہو سکتا ہے مگر بحرِ علم کی شناوری ہر شخص کے بس کا روگ نہیں۔ یہ عطیۂ خداوندی ہر جاہل، اجڈ اور کوڑ مغز کا مقدر نہیں بن سکتا۔ یہ دولت اسی کو ملتی ہے جو اس کا مستحق اور اہل ہو۔ پھر شہدہ خود ایک ایسا ہیرا تھا جو پتھر کے ٹکڑوں اور سنگ ریزوں میں رہنے کے لئے عالمِ وجود میں نہ آیا تھا بلکہ وہ صرف دنیائے علم و حکمت کو روشنی بخش سکتا تھا۔ چنانچہ شہدہ کے باپ نے اپنی عالمہ اور فاضلہ بیٹی کی رضا حاصل کر کے اپنے ایک معمولی شاگرد کو یہ اعزاز بخشا۔ وہ اگرچہ بے حیثیت اور غریب تھا۔ مگر علم و فضل اور لیاقت و ہنرمندی کے اعتبار سے شہدہ کے لئے موزوں ترین تھا۔

اس باکمال خاتون نے تحصیلِ علم سے فارغ ہو کر لوگوں کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا جہاں وہ خود درس دیتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر، فقہ و حدیث اور دیگر علومِ دینی میں شہدہ کو اتنی دسترس حاصل ہو چکی تھی کہ لوگ ان کی علمی تقاریر سن کر مبہوت ہو جاتے تھے۔ وہ ایسے ایسے نکات بیان کرتی تھیں کہ ان کے تبحرِ علمی پر حیرت ہوتی تھی۔ شہدہ کی درس گاہ اتنی مشہور ہو چکی تھی کہ لوگ اس مدرسہ سے

فارغ التحصیل ہو کر سند حاصل کرنا ایک قابل فخر اعزاز خیال کرتے تھے حتیٰ کہ حکومت بھی ان کی کوشش و کاوش کو بے حد قدر دانی کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد شہدہ کی اتنی شہرت ہوئی کہ عباسی خلیفہ المقتفی نے انہیں شرف باریابی بخشا اور ان کے علم و فضل اور قابلیت سے متاثر ہو کر ایک بہت بڑی جاگیر عطا فرمائی۔ شہدہ نے اس کی آمدنی سے دریائے دجلہ کے کنارے ایک عظیم الشان درس گاہ تعمیر کرائی جس میں سینکڑوں طلبہ بیک وقت تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ اس درسگاہ میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے طلبہ کو کھانا، کپڑا اور کتب وغیرہ شہدہ کی طرف سے ملتی تھیں۔ مستحق لوگوں کو مالی امداد بھی دی جاتی تھی اور ان کے تمام مصارف شہدہ خود ادا کرتی تھیں۔ شادی کے پینتالیس برس بعد ان کے شوہر نے وفات پائی۔ مشہور ہے کہ شہدہ نے اتنی علمی فضیلت، بلند مرتبہ و حیثیت اور شہرت و ناموری کے باوجود عمر بھر اپنے خاوند کی بے پناہ خدمت کی۔ وہ اپنے شوہر کی تمام ضروریات کا خود خیال رکھتی تھیں اور ہر وقت ان کے آرام و آسائش میں منہمک رہتی تھیں۔ اپنے شوہر سے ان کی والہانہ محبت ایک مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ اور لوگ اکثر ان کی مثال دیا کرتے تھے۔ خاوند کی موت تک شہدہ اسی راستے پر گامزن رہیں اور انہوں نے اپنے گھر کو جنت ارضی کا نمونہ بنائے رکھا۔ شہدہ کی یہی خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے لوگ انہیں فخر النساء کے نام سے یاد کرتے تھے اور ان کی راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ شہدہ نے ۵۷۴ھ میں جب کہ نوے برس کی عمر پا چکی تھیں۔ بغداد میں وفات پائی اور تادم آخر تعلیم و تدریس کا سلسلہ بڑی باقاعدگی سے جاری رکھا۔

شہدہ پہلی مسلمان خاتون تھیں جنہوں نے اپنی کوششوں اور بے پناہ محنت سے بغداد میں ایک شاندار یونیورسٹی قائم کی اور عمر بھر اپنے خرچ سے اسے چلایا۔ اس کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اس درس گاہ میں ہزاروں مردوں نے تعلیم حاصل کر کے بڑا

نام پایا اور صف اول کے فقہاء علماء میں شمار ہوئے۔ ان گنت مردوں کو ان کی شاگردی پر فخر تھا۔ ایک عرصے تک شہدہ کی دی ہوئی سندات کو علمائے عصر بطور حوالہ پیش کرتے تھے۔ اور فخریہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے شہدہ کی درسگاہ سے علم و حکمت کے موتی رولے ہیں۔

وہ بزرگ آخر ایسی ہی درس گاہوں سے نکل کر شہرت و ناموری کی بلندیوں پر پہنچے۔ جن کی علمی کاوشوں اور عرق ریزیوں کو آج بھی یورپ سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ اسلام نے عورت کو کہاں سے اٹھا کر کہاں پہنچا دیا تھا اور وہ کونسا بلند مرتبہ تھا جو ایک مسلمان عورت حاصل نہ کر سکی۔

شہدہ نے دنیائے علم و حکمت پر حکومت کرنے کے باوجود جس ایثار و قربانی کی مثال قائم کی اور انہوں نے جس طرح اپنی زندگی اور صلاحیتوں کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے وقف کر رکھا تھا ۔۔۔ وہ ہماری خود پرست بہنوں کے لئے ایک روشن مثال ہے۔ شہدہ کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ مسلمان عورت ہر حال اور ہر حیثیت میں اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے راستے سے سرمو انحراف پسند نہیں کرتی۔ وہ اپنی ملت کی خدمت، اپنی قوم کی تعمیر اور اسلام کی سربلندی کے لئے ہی زندہ رہتی ہے۔ وہ اپنے قومی فرائض انجام دینے کے باوجود اپنے گھریلو فرائض کو بھی کبھی فراموش نہیں کرتی خواہ وہ ملک کی بہت بڑی یونیورسٹی کی چانسلر کیوں نہ ہو۔

شہدہ کے بعد ساتویں صدی ہجری کی ایک خاتون بنت خداویردی کو کتابت اور خوشنویسی میں شہرت حاصل ہوئی حالانکہ اس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے مگر وہ پاؤں سے کتابت کرتی تھی۔ حکومت مصر نے اس کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا۔ بنت خداویردی کا مقبرہ اسکندریہ میں اب بھی موجود ہے۔

ام الکلام حفصۃ المرکینیہ

ایک شعلہ نوا خطیبہ اور ایک آتش بیان مقررہ
تھیں۔ فصاحت و بلاغت اور جوش و خروش کا
بحر بے کراں تھیں۔ ان کا دل ملت کے درد
سے معمور تھا۔ فیاضی اور سخاوت کی ایک
مثال تھیں۔

حفصۃ المرکینیہ

حفصۃ المرکینیہ کے ابتدائی حالات معلوم نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عہد موحدین میں موجود تھیں۔ ابویوسف منصور باللہ کے دورِ خلافت میں اندلس کے مشہور شہر اشبیلیہ میں ۵۸۲ھ میں وارد ہوئیں۔ مرکینیہ بے حد نیک، عبادت گزار، پاک سیرت، پرہیز گار اور خدا پرست خاتون تھیں۔ خود عالمہ تھیں اور علم دوست تھیں۔ فیاضی اور سخاوت کی ایک روشن مثال تھیں۔ کافی دولت مند اور صاحب حیثیت تھیں مگر اپنی تمام دولت غریبوں، مسکینوں، محتاجوں اور دکھی لوگوں پر خرچ کیا کرتی تھیں۔

حفصۃ المرکینیہ کی شہرت اور ناموری اور بے پناہ ہر دلعزیزی کا باعث ان کا زور خطابت تھا۔ وہ اپنے عہد کی ایک بے نظیر خطیبہ اور آتش نوا مقررہ تھیں — فصاحت و بلاغت اور کمالِ خطابت میں لاجواب خیال کی جاتی تھیں۔ اور پورے اندلس میں کوئی ان کا ہمسر اور ہم پایہ نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ جب تقریر کرنے کھڑی ہوتی تھیں تو مجمع مسحور و مبہوت ہو جاتا تھا۔ ان کی قادر الکلامی اور فصاحت لوگوں کو بتوں کی طرح ساکت و جامد بنا دیتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے فصاحت و بلاغت اور روانی کا ایک پرشور دریا بہہ رہا ہے۔ جس کی موجوں پر سب بہے جا رہے ہوں۔ انہیں اسلام سے والہانہ محبت تھی۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دیوانہ وار عشق رکھتی تھیں۔ دل میں مسلمانوں کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور ملت کی معمولی سی تکلیف انہیں بری طرح سے بے چین اور مضطرب کر دیتی تھی۔

ان کی تقریر کا سب سے بڑا وصف یہی خلوص تھا جس کا دامن ہر حال میں صداقت سے وابستہ رہتا تھا۔ بہت نڈر، بے باک اور بے خوف تھیں۔ وہ حکومت کے بڑے بڑے افسروں اور خلیفۂ وقت کا بھی احتساب کرتی تھیں۔ اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ کسی سرکاری عامل یا عہدے دار نے کوئی غلط کام کیا ہے یا مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت میں کوتاہی کی ہے تو ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا تھا۔ پھر اس پرشور طوفانِ خطابت میں ان لوگوں کو اپنی ہستی ایک شکستہ اور ڈوبتے ہوئے جہاز کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ قومی محبت اور مسلمانوں کے درد کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ عیسائیوں نے اندلس کے ایک صوبے پر حملہ کر کے کئی شہروں اور قصبات کو تباہ و برباد کر دیا۔ مردوں کے ساتھ عورتوں اور بچوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان کے گھروں اور کھیتوں کو جلا دیا۔ انہوں نے کئی دن تک قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم رکھا۔ ان بے پناہ مظالم کی خبر جب دارالخلافہ میں پہنچی تو چاروں طرف ایک کہرام مچ گیا۔ لوگ جوش و خروش اور غم و غصے سے دیوانے ہو رہے تھے۔ جب مرکینہ کو اس دلدوز حادثہ کی اطلاع ملی تو غصے سے چہرہ تمتما اٹھا۔ انہوں نے فوراً اشبیلیہ میں ایک فقید المثال عام جلسہ منعقد کیا جس میں لوگ لاکھوں کی تعداد میں شریک ہوئے مرکینہ نے اس جلسہ میں ایسی پرجوش تقریر کی کہ لوگ اسی حالت میں جہاد پر روانہ ہونے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اندلس کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا اور چاروں طرف ایک آگ سی لگا دی۔ اس موقع پر مرکینہ نے اندلس کے بازاروں میں جو تقریریں کیں اگر آج وہ پوری طرح محفوظ ہوتیں تو فن خطابت کا انمول سرمایہ قرار دی جاتیں۔ سلطان اس وقت مراکش میں مقیم تھے۔ حفصۃ المرکینہ نے فوراً ان کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا اور لکھا کہ اے امیر المومنین! عیسائی وحشیوں نے سلویس اس سے دور، اور بیجا کے مسلمانوں کو انتہائی بے رحمی اور

سنگ دلی سے ذبح کر ڈالا ہے۔ کیا ان بدنصیب مظلوم مسلمانوں کی چیخیں اور آوازیں آپ کے کانوں تک نہیں پہنچیں۔ آپ ہمارے سلطان ہیں اور مسلمانوں کی جان و مال کے محافظ ہیں۔ قیامت کے دن جب آپ سے اتنے مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کے ظالمانہ قتل سے متعلق سوال کیا جائے گا تو آپ کیا جواب دیں گے۔

یہ خط پڑھتے ہی سلطان نے گورنر کو ایک زبردست فوج تیار کرنے کا حکم دیا۔ مرکینہ پہلے ہی اندلس کے طول و عرض میں جہاد کا بے پناہ جوش پیدا کر چکی تھیں اور لوگ شوقِ شہادت میں سر کٹانے کے لئے بے تاب و مضطرب پھر رہے تھے۔ اندلس کے کوچہ و بازار میں الجہاد کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اور ہر سمت بے پناہ جوش پھیلا ہوا تھا۔ جب سرکاری طور پر اسلامی فوج میں شمولیت کا فرمان نافذ ہوا تو لوگ جوق در جوق لشکر میں شامل ہونے کے لئے جانے لگے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے پورا اندلس کفن بردوش ہو کر میدانِ جہاد میں نکلنے کے لئے بے قرار ہے۔ مرکینہ کی پرجوش تقریروں نے اندلس کے ہر گھر میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک عظیم الشان لشکرِ جرار تیار ہو گیا۔ چونکہ گورنر نے منتخب لوگوں کو جہاد میں شرکت کی اجازت دی تھی اس لئے بے شمار لوگ دلی تمنا کے باوجود اس سعادت سے محروم رہے۔ مسلمانوں کا یہ پرجوش لشکر جس کے کانوں میں مرکینہ کے سحر آلود الفاظ طبلِ جنگ بن کر گونج رہے تھے۔ عیسائی ٹڈی دل سے ٹکرایا اور ایک خونریز جنگ کے بعد عیسائیوں کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ فتح کی خوشخبری ملتے ہی سلطان نے حفصتہ المرکینہ کو لکھا کہ میں نے عیسائیوں کی آہ و بکا کی صدائیں یہاں بیٹھ کر سنی ہیں۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ یہ آوازیں تم نے بھی ضرور سنی ہوں گی۔ مجھے امید ہے کہ اب تمہارے درد مند اور بے چین دل کو قرار آ گیا ہو گا۔ مسلمانوں نے مظلوم شہیدوں کے خون کا بدلہ لے کر اپنی ملی غیرت کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

ذرا اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑایئے کہ ہماری فیشن پرست اور آرائش وزیبائش کی الجھنوں میں گرفتار بہنوں میں اس وقت کتنی حفصۃ المرکینہ ہیں ، کتنی ایسی خواتین ہیں جو دولت وثروت کے ہوتے ہوئے بھی مرکینہ کی سی سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتی ہوں ؟ جن کی دولت دوسروں کو دکھوں اور مصائب سے آزاد کرانے میں صرف ہو رہی ہو ؟ کتنی ایسی عورتیں ہیں جن کے قلوب میں قوم اور ملت کی ایسی بے مثال تڑپ موجود ہے ؟ ہماری ان بہنوں کی تعداد کتنی ہے جو نمائشی سرگرمیوں اور نام ونمود کی بیماری سے دور رہ کر ملک وقوم کی اس طرح خلوص وصداقت کے ساتھ خدمت کر رہی ہیں ؟ آخر مرکینہ بھی آپ کی طرح ایک مسلمان عورت تھی ، اسے قدرت نے جادو بیانی اور آتش نوائی کا وصف عطا فرمایا تھا اور اس ام اسلام نے اپنی صلاحیت سے قوم کو بیدار کرنے ، ان میں جوشِ عمل پیدا کرنے اور زندگی کی نئی روح پھونکنے کا کام اس طرح لیا کہ آج بھی تاریخ اس کے نام کو اپنے دل میں محفوظ کئے ہوئے ہے

شہزادی امینہ بنت محمدؐ

ایک بہادر اور غیرت مند خاتون جس نے
چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھر
کر بھی اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کی۔ جس
کے ضمیر کو خریدا نہ جا سکا جس کی عصمت ہیرے
اور جواہرات میں نہ تل سکی ——— تو اسے زندہ
جلا دیا گیا۔

اعلینہ بنت محمدؒ

اعلینہ دولت ہسپانیہ کے بانی اموی خاندان سے تھی۔ باپ کا نام شہزادہ محمد بن امیہ تھا جسے عیسائیوں نے اندلس پر قبضہ کرنے کے بعد زبردستی عیسائی بنا لیا تھا۔ شہزادہ محمد عیسائیوں میں فرڈی ناںڈو کے نام سے مشہور تھا۔ عراق، شام، حجاز اور دیگر ملحقہ علاقوں میں بنو امیہ کے زوال کے بعد جب عباسی خاندان برسر اقتدار آیا تو ایک اموی شہزادہ عبدالرحمن الداخل کسی نہ کسی طرح جان بچا کر ہسپانیہ کی طرف بھاگ گیا اور وہاں اس نے ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جس کی بے مثال عظمت و شوکت اور حشمت و سطوت آج بھی تاریخ عالم کے صفحات میں جگمگا رہی ہے اور عجوبۂ عالم عمارت الحمراء مسلمانوں کے تابندہ ماضی کی یاد تازہ رکھے ہوئے ہے۔ اس ملک پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک بڑی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ کے ساتھ حکومت کی مگر بعد میں باہمی انتشار و تفریق اور ریشہ دوانیوں کے باعث ان کے زوال اور انحطاط کا دور شروع ہوا تو عیسائیوں نے آہستہ آہستہ ہسپانیہ کے تمام شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت ابو عبداللہ اندلس کے تخت حکومت پر متمکن تھا جس نے لاچار و بے بس ہو کر ملک عیسائی شہنشاہ کے سپرد کر دیا۔ اور خود ذلت و خواری کے عالم میں اپنے آباؤ اجداد کے آباد کئے ہوئے بے نظیر اور خوبصورت شہروں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا ہسپانیہ سے نکل گیا۔ اندلس سے مسلمانوں کا دردناک اخراج تاریخ کا ایک بہت بڑا المیہ ہے جس کی تفصیلات پڑھ کر آج بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

عیسائیوں نے ملک پر قبضہ کرتے ہی چاروں طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ شہزادیوں اور بیگمات حرم کو سر بازار رسوا و ذلیل کیا۔ مسلمان عورتوں کی آبرو ریزی کی گئی اور بے شمار انسانوں کو انتہائی بہیمانہ طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ سرزمین اندلس مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بن گئی۔ اور ہر طرف مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ عالیشان تاریخی مسجدوں کو گرجوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور ان درندوں نے مسلمانوں کی عظمت و شوکت کا ایک ایک نشان مٹانے کے لئے ہر بڑے سے بڑا ظلم روا رکھا۔ لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کو نشانۂ ستم بنایا گیا صرف اس کو زندہ رہنے کی اجازت دی گئی جس نے مجبور ہو کر اپنا مذہب تبدیل کر لیا یا ان کی غلامی کا طوق لعنت زیب گلو بنا لیا۔ شہزادہ محمد بھی ان بدنصیب افراد میں سے تھا۔ جنہوں نے مسلسل جبر و تشدد سے تنگ آکر کسی مناسب گھڑی کے انتظار کے لئے مجبوراً فاتح شہنشاہ کا مذہب قبول کر لیا۔ اینہ اسی بدقسمت شہزادے کی بیٹی تھی جو اس وقت بہت کم سن تھی فاتح فوج کے سپاہیوں نے معصوم شہزادی کو زبردستی اغوا کر کے باپ سے جدا کر دیا اور اور اس کا نام اسبیلہ رکھ دیا۔ ننھی اینہ کو کچھ عرصہ بعد عیسائیوں کے ایک مذہبی سکول میں تعلیم و تربیت کے لئے بھیج دیا گیا تاکہ وہ اپنے مذہب؛ اور اپنے ماضی سے بالکل بے تعلق ہو کر پرورش پا سکے۔ اینہ نے اسبیلہ کے نام سے اس رومن کیتھولک گرجے میں تمام بچپن بسر کیا اور جب سن بلوغ کو پہنچی تو ہسپانیہ کے عیسائی حکام نے اسے کنیز بنا کر اپنی ملکہ کے دربار میں بطور تحفہ پیش کرنا چاہا۔ اگرچہ اینہ کو اس کے مذہب اور سرپرستوں سے بالکل الگ تھلگ رکھا گیا تھا۔ مگر عیسائی اس کا کوئی علاج نہ کر سکے کہ اس غیور شہزادی کی رگوں میں ایک غیرت مند عرب خاندان کا خون گردش کر رہا تھا جوان ہوتے ہی اس میں وہ تمام اوصاف ظاہر ہونا شروع ہو گئے جو اس کے حکمران خاندان کا طرۂ امتیاز تھے۔ وہ فطری طور پر بے حد غیور، شجاع، نڈر اور عصمت مآب

ثابت ہوئی۔ عیسائی حکام نے اسے ملکہ کی خدمت گار بنانے کے لیئے بڑے بڑے لالچ دیئے۔ ہر ممکن طریقے سے ڈرایا دھمکایا اور مرعوب کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس پر بے پناہ سختیاں کی گئیں اور تکالیف میں مبتلا کیا گیا مگر امینہ نے یہ حیثیت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ کنیز بننے پر موت کو ترجیح دے گی۔ اندلس کے عیسائی حکام اسے وہاں رکھنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ اس کا باپ بھی اسی شہر میں موجود تھا اور دوسرے کئی لوگ بھی اس راز سے اندرونی طور پر آگاہ تھے۔ اس لیئے انہیں خطرہ تھا کہ امینہ کو کسی طرح صحیح صورت حال سے آگاہ ہونے کا موقع نہ مل جائے۔ دوسری طرف الحمراء کا گورنر جان البورپز شہزادی کے حسن و جمال کو ہوس بھری نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اس کی ہر ممکن کوشش یہ تھی کہ اگر شہزادی امینہ ملکہ کے دربار میں جانا پسند نہیں کرتی تو قصر الحمراء میں اس کی داشتہ بن کر رہنا قبول کرے مگر امینہ ایسی غیرت مند اور باعصمت دوشیزہ اس ذلت کو کیسے قبول کر سکتی تھی۔ جب وہ لوگ کسی طرح امینہ کو اپنے ڈھب پر نہ لا سکے تو انہوں نے اس بے کس و مجبور لڑکی کو قصر الحمراء کے ایک کمرے میں نظر بند کر دیا اور اس کی کڑی نگرانی ہونے لگی۔ اسی زمانے میں اندلس کے پہاڑی علاقوں میں رہنے والے عرب مسلمانوں نے عیسائی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ ہسپانوی فوج چاروں طرف سے ان پر ٹوٹ پڑی اور لاکھوں کی تعداد میں مسلح سپاہیوں نے ان مجاہدین کو گھیرے میں لے کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ ان کی جھونپڑیاں اور خیمے تک جلا دیئے گئے اور جو مسلمان بھی سامنے آیا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ امینہ کا باپ محمد بھی اسی جنگ میں کام آگیا۔ اور ہسپانوی سپاہیوں نے غداری کی سزا کے طور پر اس کا سر تن سے جدا کر کے نیزے پر چڑھا دیا اور اسے اپنے سپہ سالار کے پاس بھیج دیا۔ شہزادہ محمد کے ایک وفادار ساتھی یعقوب نے جو مذہب کے لحاظ سے یہودی تھا یہ خبر سنی تو اسے

بہت صدمہ ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ شہزادہ محمد اندرونی طور پر اندلس میں اسلامی اقتدار بحال کرنے کے لئے تدابیر سوچتا رہتا تھا اور کسی مناسب موقع کی انتظار میں زندہ تھا یعقوب کو شہزادی ایینہ کے اغوا اور حراست کا پورا علم تھا وہ اسی وقت شب کی تاریکی میں قصر الحمراء پہنچا تو دربان نے اسے اندر جانے سے روک دیا۔ یعقوب نے اسے رشوت دے کر اندر جانے کی اجازت حاصل کر لی اور شہزادی ایینہ کو اس کے کمرے میں ملا۔ شہزادی ایینہ نے اسے بتایا کہ وہ جنوبی پہاڑیوں میں برپا ہونے والی بغاوت سے باخبر ہے اور اسے یہ بھی علم ہے کہ یہ جنگ ہسپانوی فوج اور مسلمان عربوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ شہزادی نے یعقوب کو اپنے احساسات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس دوران نہ جانے کیوں بے اختیار اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ مسلمان باغیوں کی امداد کے لئے محاذِ جنگ تک پہنچ جائے حالانکہ وہ رومن کیتھولک عیسائی تھی مگر وہ حراست میں ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکی۔ یعقوب نے اسے کہا کہ بیٹی! تم نہ ہسپانوی ہو اور نہ رومن کیتھولک عیسائی۔ بلکہ تم ایک مسلمان لڑکی ہو۔ اندلس کے حکمران خاندان بنو ابیہ کی شہزادی ہو۔ تمہارے باپ کا نام محمد بن ایبہ ہے جسے بزور عیسائی بنا لیا گیا تھا۔ اور وہ فرڈی نانڈو کے نام سے مشہور تھا۔ میں تمہیں یہی بتانے آیا تھا کہ تمہارا باپ اس جنگ میں قتل ہو چکا ہے۔ یعقوب نے شہزادی ایینہ کو اس کے اغوا اور گرجے میں تربیت کا تمام واقعہ سنا دیا اور بتایا کہ اس کا نام اسیبلہ نہیں بلکہ ایینہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم اس کمرے میں تنہا بند ہو اور کسی شخص کو تم سے ملنے جلنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ شہزادی ایینہ کو یہ سن کر سخت صدمہ ہوا کہ وہ اپنے مذہب سے محروم کر دی گئی ہے اور اپنی قوم سے علیحدہ ان درندوں کی قید میں پڑی ہے۔ اس کے علاوہ اسے اپنے باپ کی موت کا بھی بہت افسوس ہوا۔ اس نے یعقوب کو بتایا کہ الحمراء کا گورنر جان الوریز اس کی عزت و ناموس پر ڈاکہ ڈالنے کی فکر میں ہے اور ہر وقت اسے پریشان کرتا رہتا ہے۔

امینہ نے یعقوب کو یہ بھی بتایا کہ اب جان الوریز جبر و تشدد پر اتر آیا ہے اس لیئے وہ اپنی آبرو بچانے کے لیئے جلد از جلد قصر الحمراء سے نکل جانا چاہتی ہے۔ یعقوب نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ شہزادی امینہ نے اسرار دارانہ لہجے میں کہا کہ میں نے اس دیوار میں ایک سوراخ بنا لیا ہے مگر یہ ابھی تک مکمل نہیں ہوا آج رات میں اسے مکمل کر لونگی تم گھوڑے لے کر باہر پیرا انتظار کرنا۔ یعقوب بہت نیک اور وفادار شخص تھا اس نے شہزادی کے حکم کی تعمیل کا وعدہ کیا۔ امینہ نے رخصت ہوتے وقت اس کا خنجر بھی حفاظت کے لیئے اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کے بعد جان الوریز شہزادی امینہ کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے جبر و تشدد کے ذریعہ شہزادی امینہ کی غیرت اور شجاعت کا امتحان لینے کی کوشش شروع کی تو دوسرے لمحے یعقوب کا دیا ہوا خنجر الوریز کے سینے میں پیوست ہو چکا تھا اور اس کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی۔ شہزادی امینہ نے اطمینان سے خنجر نکال کر صاف کیا اور باہر نکل گئی۔ قصر الحمراء کے باہر یعقوب گھوڑے لیئے اس کا منتظر تھا۔ دونوں ہسپانیہ کی سرحد سے نکل جانے کے لیئے تیزی سے سفر کرنے لگے۔ مگر صبح کے وقت ساحل سے قدرے فاصلے پر ہی گرفتار کر لیئے گئے۔ کیونکہ ہسپانوی فوج کو علی الصباح ہی اپنے گورنر کے قتل کا علم ہو گیا تھا۔ اور انہوں نے جنوبی بستیوں میں ہرکارے دوڑا دیئے تھے۔ ان دونوں کو گرفتار کر کے غرناطہ لایا گیا۔ ہسپانیہ کی ظالم عدالت نے یعقوب کی کھال کھینچنے اور شہزادی امینہ کو زندہ جلا دینے کا حکم دیا۔

شہزادی کے لیئے ایک دہشتناک الاؤ تیار کیا گیا۔ اور وہ زنجیروں میں جکڑ کر وہاں لائی گئی۔ اس اندوہناک منظر کا تماشا دیکھنے کے لیئے شہر کے ہزاروں مرد اور عورتیں جمع تھیں شہزادی کو ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا اور چشم زدن میں آگ کے سرکش شعلے موت کا رقص بن کر اس کے گرد ناچنے لگے۔ شہزادی امینہ نے مرنے سے قبل تماشائیوں سے مخاطب ہو کر انتہائی مؤثر انداز میں کہا۔

تم ہمارا جسم تو جلا کر راکھ کر سکتے ہو مگر میری روح کو نہیں جلا سکتے۔ میری روح ہمیشہ زندہ رہے گی۔ میرے نہاں خانۂ دل کے اندر جو شمع ہدایت روشن ہو چکی ہے اسے تمہاری جلائی ہوئی آگ کے شعلے نہیں بجھا سکتے یہ شمع میری راکھ کے ہر ذرے میں قیامت تک جلتی رہے گی۔ میں اس دنیا میں رہنا پسند نہیں کرتی۔ میرا گھر جنت میں ہے مگر اے ظلم و عدوان کے سانچے میں ڈھلے ہوئے درندو! بہت جلد تمہاری باری بھی آنے والی ہے اور تمہیں ان جرائم کی عبرت ناک سزا ملے گی جن کا ارتکاب تم ہسپانیہ کی حسین و جمیل سرزمین پر کر رہے ہو۔ میں اس آگ کو خوشی سے قبول کرتی ہوں کیونکہ دوزخ کی آگ کے مقابلے میں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

تھوڑی دیر بعد آگ کے تند و تیز شعلوں نے شہزادی اعلینہ کو اپنی لپیٹ میں لیکر ہمیشہ کے لئے دنیا کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا مگر اس بہادر اور عصمت مآب دوشیزہ کی خاک کا ہر ذرہ آج بھی اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے کہ مسلمان عورت کی عصمت و ناموس کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں خرید سکتی۔ وہ چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھر کر بھی اپنی آبرو کی حفاظت کرنا جانتی ہے ـــــ وہ ایک بہادر اور شجاع کی موت مرنا اپنے لئے باعث سعادت سمجھتی ہے۔ کفر و بدی کی طاقت کے سامنے سر جھکانا کسی صورت گوارا نہیں کرتی۔ اگر کبھی ایسا ہوتا ہے تو یقین کر لو کہ وہ مسلمان کہلانے والی عورت اسلام پر ایک تہمت بن کر زندہ ہے۔ اس کے جسد مردہ میں اسلام کی روح نہیں بلکہ کچھ اور ہے جس کا ایک سچی مسلمان عورت کی زندگی سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔

باب سوم

حمیدہ بانو بیگم

وہ بہادر اور شیر دل خاتون جو قومی ابتلاء
کے وقت آہن پوش ہو کر میدانِ جنگ
میں نکلی۔ جس کی پُر جلال آواز اور حق گوئی نے
سلطان تیمور اور اس کے فوجی افسروں پر سکتے
کا عالم طاری کر دیا۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں
(اقبال)

حمیدہ بانو بیگم

اصل نام امتہ الحبیب تھا۔ ایرانی نژاد تھیں۔ ان کا باپ یزدانی مشہور ترک شہنشاہ بایزید کی فوج کا ایک نامور جرنیل تھا۔ ترکستان میں پیدا ہوئیں اور اپنے جنگجو باپ کے زیرِ سایہ تربیت حاصل کی۔ امتہ الحبیب کو بچپن ہی سے شہسواری اور فنِ سپہ گری میں مہارت حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا چنانچہ انہوں نے ایک سپاہی عورت کی طرح عسکری تربیت حاصل کی اور نو عمری کے زمانے میں ہی کئی حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے۔ چنانچہ امتہ الحبیب کو بھی اپنے باپ کی زیرِ کمان فوج میں افسر مقرر کر دیا گیا۔ امتہ الحبیب اپنی بہادری، شجاعت اور اولو العزمی، جرأت اور شرافت کی وجہ سے فوج میں بے حد عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ سب لوگ ان کے پاکیزہ کردار اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف کے معترف تھے۔ ایک دفعہ امیر تیمور کی خونخوار فوج نے عذابِ الٰہی بن کر بایزید کی سلطنت کو گھیر کر پامال کرنا شروع کر دیا۔ بایزید کی فوجیں میدانِ جنگ میں بڑی بہادری اور ہمت کے ساتھ مقابلہ کرتی رہیں۔ مگر انتہائی خونریز جنگ کے بعد ترکوں کو شکستِ فاش ہوئی۔ امتہ الحبیب اپنے بہت سے بہادر سپاہیوں اور جان نثاروں کے ساتھ زندہ گرفتار کر لی گئیں۔ بایزید نے سلطنت ہاتھ سے جاتے دیکھ کر عجز و انکساری سے صلح کی پیش کش کی اور امیر تیمور سے درخواست کی کہ وہ مزید خونریزی بند کر کے مناسب شرائط پر صلح کرے مگر تیمور اس وقت فتح کے نشے میں چور تھا اس نے بڑی بے اعتنائی سے بایزید کی یہ

درخواست ٹھکرادی اور دوسرے دن تمام ترک سپاہیوں اور افسروں کے قتلِ عام کا حکم صادر کر دیا۔ امتہ الحبیب نے امیر تیمور کا یہ حکم سنا تو انہیں سخت طیش آیا۔ ایک بہادر اور شیر دل خاتون کے لیئے اس طرح ذلت اور بے بسی کی موت مرنے کا خیال بہت اذیت ناک تھا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مرنے سے پہلے ایک مرتبہ امیر تیمور کے ظلم و تشدد اور سنگ دلی کے خلاف ضرور سخت ترین الفاظ میں احتجاج کریں گی تاکہ وہ حقیقت سے آشنا ہو سکے کہ اس طرح ہزاروں بے گناہ انسانوں کے خون سے ہولی کھیلنا شجاعت اور بہادری کی توہین ہے۔ چنانچہ وہ اسی طرح مردانہ فوجی لباس میں امیر تیمور کے دربار میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ مجھے کچھ کہنا ہے۔ امیر تیمور نے اپنے افسروں اور درباریوں سے مشورہ کے بعد انہیں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی اجازت دی۔ امتہ الحبیب نے انتہائی جرأت اور بے باکی سے امیر تیمور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اے شہنشاہ! تو نے بایزید پر کسی تقصیر اور گناہ کے بغیر بلاوجہ چڑھائی کر کے ہزاروں انسانوں کو خاک و خون میں تڑپایا ہے اچھی طرح سمجھ لے کہ یہ ایک ایسا سنگین جرم ہے جو قدرت کبھی معاف نہیں کرے گی۔ تو نے ستر ہزار بے گناہ ترکوں کو فریب دے کر سرنگ کے ذریعہ اڑا دیا۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تیرے دل میں ندامت کی ایک معمولی سی لہر بھی پیدا نہ ہوئی۔ تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ ترکوں کا قتل نہیں ہے بلکہ تو اسلام کی جڑوں کو کھود رہا ہے۔ کیا تو بتا سکتا ہے کہ کسی بھی آسمانی شریعت یا دنیا کے قانون میں مسلمانوں کو اس قدر بے رحمی اور سنگ دلی سے موت کے گھاٹ اتارنا جائز ہے؟ بایزید نے نہایت عجز و فروتنی کے ساتھ تجھے صلح کا پیغام دیا کہ یہ سرزمین اور زیادہ مسلمانوں

کے خون سے لالہ زار نہ بنے۔ مگر فتحمندی کے غرور اور قوت کے نشے نے تجھے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ تو اس درخواست پر سنجیدگی سے غور کر سکے۔

اے فاتح شہنشاہ! ہماری مانند ایک روز تیری زندگی کا پیمانہ بھی لبریز ہونے کو ہے اور تجھے بھی اس دنیائے فانی سے منہ موڑ کر ایک دن ایک بڑے شہنشاہ کے دربار میں کھڑا ہونا ہے۔ جب وہ شہنشاہوں کا شہنشاہ تجھ سے پر غضب لہجے میں ان مظلوموں کی بابت سوال کرے گا تو تیرے پاس کیا جواب ہو گا؟ تو اس کی قہاری اور جباری سے کیسے بچ سکے گا؟ دنیا کی کون سی طاقت تجھے اس کے عتاب سے بچا سکے گی کیا یہ خونخوار سپاہی اس وقت بھی تیرا ساتھ دیں گے؟ کیا ان کی خون آشام تلواریں اس وقت تیرے لئے ڈھال بن سکیں گی؟ اے امیر! آج تک ہم نے مظلوم اور بے گناہ قیدیوں پر بہادروں کی تلواروں کو موت کی بجلی بن کر گرتے نہیں دیکھا۔ ہم بے بس اور مجبور قیدی ہیں۔ ہمارے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ نہایت بزدلانہ اور نفرت انگیز حکم ہے کہ اس بے کسی اور بے بسی میں تو نے ہمارے قتل کا فیصلہ کیا ہے۔

اس کے بعد امۃ الجیب نے وفور جوش میں اپنا آہنی خود اتار کر زمین پر پٹخ دیا اور کہا کہ اے سلطان! میری طرف دیکھ، میں ایک کمزور اور ناتجربہ کار عورت ہوں۔ کیا تو اندازہ نہیں کر سکتا کہ جس قوم کی عورتیں اتنی بے باک اور بہادر ہیں ان کے مرد شجاعت و دلیری میں کیسے ہوں گے۔

ایک شیر دل خاتون کو فوجی لباس میں ملبوس اس طرح بے خوفی سے گفتگو

کرتے ہوئے دیکھ کر سلطان تیمور کے دربار پر سناٹا چھا گیا کیونکہ اس وقت امتہ الحبیب ایک ایسے شخص کے سامنے کھڑی تھی جس کے ایک اشارۂ ابرو پر ہزاروں انسان موت کے آغوش میں سلا دیئے جاتے تھے جس کا ایک اشارہ سینکڑوں جنگجو مردوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ وہ سلطان تیمور کے سامنے کھڑی تھیں جس کی ہیبت سے دنیا بھر کے حکمرانوں کا زہرہ آب ہوتا تھا۔ جس کا ذکر سن کر سینوں میں دل کانپ جاتے تھے۔ وہ امیر تیمور جس کے سامنے اس کے اپنے بہادر فوجی افسر خزاں زدہ پتے کی طرح زرد ہو جاتے تھے۔ امتہ الحبیب کی یہ مجاہدانہ گفتگو سن کر خود امیر تیمور مبہوت ہو گیا اور اس کی صاف گوئی نے سلطان کو حیرت زدہ کر دیا وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے کچھ سوچتا رہا اور پھر امتہ الحبیب اور ان کے سپاہیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا۔ امیر تیمور نے اسی وقت امتہ الحبیب کے باپ کے پاس شادی کا پیغام بھیجا جسے منظور کر لیا گیا۔ اور امتہ الحبیب سلطان تیمور کے نکاح میں آگئیں۔ شادی کے بعد امیر تیمور نے انہیں حمیدہ بانو بیگم کا خطاب دیا اور شہنشاہ بیگم کہلائیں۔ ان سے امیر تیمور کے کئی بچے ہوئے مگر زندہ نہ رہے۔ امتہ الحبیب صرف ایک شجاع اور بہادر خاتون ہی نہ تھیں بلکہ وہ بے حد علم دوست اور دانش مند تھیں۔ انہوں نے کئی ایک کتابیں بھی تصنیف کیں جو محفوظ نہ رہ سکیں۔ سنتے ہیں جب امیر تیمور کا انتقال ہوا تو حمیدہ بانو بیگم زندہ تھیں۔ خاوند کی وفات کے بعد سوتیلے بیٹے نے انہیں تنگ کرنا شروع کر دیا اور طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔ آخر انہوں نے بیٹے کے مظالم سے تنگ آکر طفلس میں قیام کیا مگر وہاں بھی انہیں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا تو قسطنطنیہ اٹھ آئیں اور اکسٹھ برس کی عمر میں وہیں انتقال کیا۔

حمیدہ بانو بیگم کی زندگی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ گئے گذرے دور میں بھی ایک ایسی سچی خاتون جس نے مسلمانوں کے گھرانے میں تربیت حاصل کی ہو کبھی

ذلت ونکبت کے سامنے سر جھکانا گوارا نہیں کرتی۔ موت اس کے سامنے کھڑی ہوکر مسکراتی ہے مگر وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر صداقت شعاری اور حق گوئی کی اسلامی روایت کو نئی زندگی عطا کردیتی ہے۔ اسے امیر تیمور ایسے جابر وقاہر شہنشاہ کی ہیبت وسطوت بالکل مرعوب نہ کرسکی۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں ہر سمت دشمنوں کی تلواریں بے نیام نظر آرہی تھیں اور جہاں اس کی گونجتی ہوئی آواز کو ہمیشہ کے لئے ختم کردینا بالکل معمولی بات تھی ـــــ ایک زنجیروں میں جکڑی ہوئی قیدی عورت کس دلیری کے ساتھ اعلانِ حق کرتی ہے۔ حمیدہ بانو بیگم نے اس فاتح شہنشاہ کے دربار میں اسلام دوستی اور قوم پروری کی ایسی مثال قائم کی جس پر آج تک تاریخ فخر کرتی ہے۔ اس نے اپنی قوم کی عظمت کو چار چاند لگادیئے اور ترکوں کا سر بہت بلند کردیا۔

کہاں ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ عورت کمزوری اور مکروفریب کا دوسرا نام ہے ایک معمولی مسلمان عورت کا وجود اس الزام کی مجسم تردید ہے۔

ہمارے وطن کی عظمت کا بلند ترین تصور بھی ہماری بہنوں کے ایسے ہی کردار کا منتظر ہے ـــ اس کردار کا قصرِ عظیم صرف سچائی، صداقت، جرأت اور خدا پرستی کی بنیادوں پر تعمیر ہوا کرتا ہے۔ خودغرضی اور خود پرستی اسے ہمیشہ منہدم کرنے کا باعث ہوتی ہے۔

گیتی آرا بیگم

معرکۂ حق و باطل میں فولاد ——— اور گھر کی
چار دیواری میں ریشم کی طرح نرم اور حلیم ———
بہادر، مدبر، دور اندیش اور مستقل مزاج خاتون
جس کی عسکری قابلیت اور جنگی صلاحیت نے
مردوں کی شجاعت اور مردانگی سے خراجِ
اطاعت وصول کیا۔ جب شہزادی تھی تو جنگجو
سپاہی تھی ——— اور صرف اپنے حق کے لئے
تلوار اٹھانا جانتی تھی ——— جب ملکہ بنی تو رعایا
کے لئے رحمتِ خداوندی، خاوند کے لئے
باعثِ طمانیت، علم و فضل کے لئے ابرِ باراں
اور غریبوں کیلئے غیبی امداد بن گئی۔

گیتی آرا بیگم

گیتی آرا نام۔ زابلستان کے حکمران علی مردان خان کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ بچپن کے حالات زیادہ معلوم نہیں ہیں۔ باپ نے اپنی اکلوتی نورِ نظر کی اعلےٰ اور مکمل تربیت کے لیئے بڑا اہتمام کیا۔ اسے علوم و فنون میں یکتائے روزگار بنانے کے لیئے وقت کے نامور علماء کی خدمات حاصل کیں۔ اور زابلستان کے بہترین دماغ اس کی تعلیم و تربیت کے لیئے مامور ہوئے۔ شہزادی کو بچپن ہی سے فنونِ حرب سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں گیتی آرا نے مروجہ علوم پر حیرت انگیز عبور حاصل کر لیا۔ وہ علم و فضل میں زابلستان کے اندر اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ سخن فہم اور علم دوست ہونے کے علاوہ بہترین مصورہ تھی۔ قدرت نے حسن صورت کے ساتھ بے پناہ صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ جنہیں بہترین تعلیم و تربیت نے اتنا اجاگر کیا کہ پورا زابلستان گیتی آرا بیگم کے نام کی دھوم سے گونج اٹھا۔

شہزادی کی عمر ابھی بارہ سال کی تھی کہ اس نے دارالحکومت میں عورتوں کو عسکری تربیت دینے کے لیئے ایک اسکول قائم کر دیا۔ چونکہ وہ خود فنونِ حرب میں کمال مہارت رکھتی تھی۔ اور اس کم عمری میں ہی بہترین فوجی افسروں کی تربیت نے اسے ایک ماہر جرنیل بنا دیا تھا۔ اس لیئے اسے جنگی امور اور عسکری تعلیم و تربیت سے بہت لگاؤ تھا۔ علی مردان خاں نے اپنی بیٹی کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی اور وہ بیٹوں کی طرح اس کی قدر و منزلت کرتا تھا۔ گیتی آرا بیگم نے فوجی اسکول قائم کرتے ہی

اپنی قلمرو میں یہ حکم نافذ کرا دیا کہ بیس سے پچیس سال تک کے درمیان عمر کی تمام غیر شادی شدہ خواتین اس اسکول میں لازمی طور پر فوجی تربیت حاصل کریں۔ چونکہ دنیا کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا اسکول تھا اس لئے لوگوں نے قدرے مخالفت بھی کی مگر کوئی شخص علی مردان کے حکم کی نافرمانی نہ کر سکا اور تھوڑے ہی عرصے میں تقریباً چار ہزار عورتیں گیتی آرا کے اسکول میں تربیت حاصل کرنے لگیں۔ شہزادی نے ان کے لئے بہترین اتالیق اور فوجی استاد مقرر کئے۔ انہیں ہر قسم کے سامان حرب اور جدید اسلحہ سے آراستہ کرنے کے لئے بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نئے تجربہ کو کامیاب بنانے میں علی مردان کا نصف سے زیادہ خزانہ خالی ہو گیا۔ اور امرائے دربار نے دبے الفاظ میں اس بیکار مہم پر روپیہ ضائع کرنے سے منع بھی کیا مگر علی مردان خان نے شہزادی کی کسی خواہش کو رد کرنا پسند نہ کیا۔ گیتی آرا کے فوجی اسکول میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے والی عورتوں کی تعداد بتدریج بڑھتی رہی۔ کچھ عرصے بعد بارہ ہزار تربیت یافتہ اور اسلحہ جنگ سے لیس زنانہ فوج شہزادی کے اشارۂ ابرو پر کٹ مرنے کے لئے تیار موجود تھی۔ شہزادی اپنی فوج کی تمام ضروریات کا خود خیال رکھتی اور اپنا زیادہ وقت ان کی تنظیم میں صرف کرتی۔ وہ ہفتے میں کئی دفعہ ان کے دستوں کا معائنہ کرنے کے لئے خود جاتی اور ان کی جنگی مشقوں میں بڑے جوش و انہماک کے ساتھ حصہ لیتی۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ علی مردان خان کا انتقال ہو گیا۔ مردانہ فوج نے عورت کی کمان میں رہنے سے انکار کر دیا اور اسکے بھائی نے تخت پر قبضہ کر لیا وزیر اعظم نے تمام امرائے دربار سمیت نئے حکمران کی اطاعت قبول کر لی یہ خطرناک صورت حال دیکھ کر شہزادی نے وزیر اعظم کو نہایت سخت لہجے میں لکھا کہ وہ نمک حرامی کا ثبوت نہ دے اور اس کا حق غصب کر کے خانہ جنگی کا باعث نہ بنے کیونکہ جب وہ زندہ ہے تو کوئی دوسرا شخص علی مردان کے تاج و تخت کا وارث نہیں بن سکتا۔ وزیر اعظم نے جواب میں لکھا کہ زابلستان پر کبھی کسی عورت نے حکومت نہیں کی اور نہ اب ایسا ہو سکے گا شہزادی کو عورتوں کی فوج پر بھروسہ کر کے اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیئے۔ وزیر اعظم کے اس گستاخانہ جواب سے شہزادی کو سخت غصہ آیا اور اس نے جنگ کی باقاعدہ تیاری شروع کر دی۔

اس نے مزید وقت ضائع کئے بغیر زنانہ فوج کے ساتھ قلعے پر چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ تاریخ نے شاید پہلی اور آخری مرتبہ عورتوں کو اس طرح مردوں کے مقابل صف آرا دیکھا۔ تین گھنٹے کی خونریز جنگ کے بعد مردانہ فوج کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں تیرہ سو عورتیں قتل ہوئیں اور بے شمار مرد سپاہی کام آئے۔

فتح کے بعد شہزادی گیتی آرا نے تختِ حکومت پر قدم رکھا اور عام معافی کا اعلان کر دیا۔ اس وقت امیر تیمور کا بیٹا میراں شاہ سریر آرائے سلطنت تھا۔ اس نے جب شہزادی کی حیرت انگیز شجاعت، مردانگی، اسکے حسن و جمال اور علم و فضل کے واقعات سنے تو بڑی قدر دانی کا اظہار کیا اور شادی کی خواہش ظاہر کی۔ شہنشاہ کا خط پڑھ کر شہزادی نے اپنے مشیروں اور جان نثاروں سے مشورہ کیا تو انہوں نے رائے دی کہ میراں شاہ کی قوت سے ٹکرانا گویا اس سے دشمنی مول لینا زابلستان کی تباہی اور بربادی کو دعوت دینا ہے کیونکہ شہزادی کی زنانہ اور مردانہ فوج مل کر بھی تیموری سلطنت کا چند گھنٹے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ گیتی آرا نے کافی غور و خوض کے بعد نکاح کے لئے چند شرائط پیش کیں جنہیں میراں شاہ نے بخوشی منظور کر لیا۔ سمرقند میں بڑی دھوم دھام سے شادی کی رسوم انجام دی گئیں اور گیتی آرا ایک بہت بڑی سلطنت کی ملکہ بن گئی۔ میراں شاہ کے حرم میں داخل ہونے کے بعد گیتی آرا اپنے خاوند کی دستِ راست ثابت ہوئی اور انتظام و انصرام سلطنت میں شہنشاہ ہمیشہ اسی کی صائب رائے کو مقدم رکھتا تھا۔ میراں شاہ خود کہا کرتا تھا کہ اگر گیتی آرا نہ ہوتی تو وہ بہت پہلے ہلاک ہو چکا ہوتا۔ گیتی آرا نے جہاں سلطنت تیموری کا انتظام درست کیا وہاں عورتوں کی عام تعلیم کے لئے بہت وسیع انتظامات کئے۔ جگہ جگہ درسگاہیں اور مدرسے قائم کئے۔ حدودِ مملکت میں اسلامی قانون نافذ کرایا اور اس پر پوری سختی سے عمل کرایا۔ تھوڑے ہی عرصے میں یہ حالت ہو گئی کہ کوئی شخص شرعی احکام کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی جیب خاص سے ملک میں عربی مدارس کا ایک جال بچھا دیا جہاں ہزاروں طلبہ شاہی خرچ پر دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ گیتی آرا بیگم نے رفاہ عامہ کے کاموں

کی طرف توجہ دی تو کئی نئی سڑکیں اور پل تعمیر کرائے۔ بیماروں کے لیئے ایک بہت بڑا ہسپتال قائم کیا۔ بیکاروں کیلئے کسبِ معاش کا بندوبست کیا۔ وہ اپنے خاوند کے مزاج پر اس طرح حاوی ہو چکی تھی کہ میراں شاہ اس سے مشورہ کیئے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتا تھا۔ گیتی آرا بیگم بھی امورِ سلطنت میں ہاتھ بٹانے کے علاوہ اپنے شوہر کی بے پناہ خدمت کرتی تھی۔ حرم کی چار دیواری میں وہ ایک نیک، وفا شعار، خدمت گزار اور سلیقہ شعار بیوی تھی۔ گیتی آرا بیگم نے تھوڑے ہی عرصے میں نہ صرف سلطنت کی کایا پلٹ کر رکھ دی بلکہ خود میراں شاہ کے مزاج میں بھی حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔ وہ برفانی راتوں کی ناقابلِ برداشت سردی میں سمرقند کے بازاروں، گلیوں اور مضافات میں رعایا کی تکالیف معلوم کرنے کے لیئے گھومتا رہتا اور ہر دکھی شخص کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ گیتی آرا بیگم کی صحیح تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

گیتی آرا بیگم کی زندگی رزم و بزم — جلوت و خلوت — حرم اور میدانِ جنگ کے اتصال کی ایک انوکھی کہانی ہے۔ وہ نہایت دلیر، جنگجو اور بہادر تھی — علوم و فنون کا مجسمہ تھی مگر باپ کی زندگی میں ایک نیک، باعصمت، اور سعادتمند بیٹی تھی۔ اس نے اپنی قابلیت اور صلاحیت سے باپ کی زندگی کے اس خلا کو پورا کر دیا جو اولادِ نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو چکا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد اس نے انتہائی ناساعد حالات میں بھی ناانصافی اور ظلم کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا جو مسئلہ دلائل اور پند و نصائح سے حل نہ ہو سکا اسے میدانِ جنگ میں نوکِ شمشیر سے حل کر کے تاریخ عالم کو ایک حیرت انگیز تجربہ بخشا۔ ایک عظیم الشان سلطنت کی ملکہ بننے کے بعد وہ ایک لائق، وفا شعار اور اطاعت گزار بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے میراں شاہ لیسے اکھڑ اور ضدی مزاج کے شخص کو حلم و عفو کے سانچے میں ڈھال دیا۔

کہاں آج کی وہ خواتین جو سیم و زر کی جھنکار سے ہی مدہوش ہو جاتی ہیں۔ معمولی سا اقتدار انہیں فرعونِ بے سامان بنا دیتا ہے اور علم و فضل کی ذرا سی چاشنی انہیں اعتدال کی حدود سے کہیں دور لے جاتی ہے۔ وہ اپنی ذات کو کائناتِ عالم کا محور سمجھ کر یوں بات کرتی ہیں جیسے ان سے پہلے اور ان کے بعد دنیا میں کوئی دوسرا نہیں۔ آج نگاہیں ان خواتین کی منتظر ہیں جو

م معراجِ کمال پر پہنچ کر بھی نخوت و تکبر اور غرور و پندار سے کوسوں دور تھیں۔ قدرت انہیں جتنا بلند کرتی تھی وہ اتنا ہی جھکنا سیکھ جاتی تھیں۔ وہ اپنی ذات کو بھول کر دوسروں کے لیئے جینا اپنا ایمان سمجھتی تھیں۔ خدمت کرنا ان کا مقصدِ حیات تھا اور دوسروں کے غم اپنے دل میں سمو لینا ان کا عشق تھا۔

ملکۂ ہند

بیگم ناصر الدین محمود

ایک لاڈلی شہزادی جس نے ملکہ بننے کے
بعد ایک کنیز کی طرح اپنے درویش خاوند کی خدمت
کو اپنا شعار بنایا تھا۔ جس نے قصرِ شاہی کے اندر
فقر و استغنا کی قندیلیں روشن کر کے دورِ اوّل کی
مسلمان خواتین کی یاد تازہ کر دی۔

بیگم سلطان ناصر الدین محمود

اس سادہ منش اور شوہر پرست ملکہ کی ابتدائی زندگی کے حالات ماضی کی تاریکیوں میں گم ہو کر رہ گئے ہیں اور تاریخ کے اوراق اس پردہ نشین اور باعصمت خاتون کی عظمت کردار کو اس وقت کے معاشرتی حالات کی وجہ سے محفوظ نہیں رکھ سکے۔ تذکروں میں اس نیک دل ملکہ کا ذکر کہیں کہیں سلطان ناصر الدین محمود کے حالات میں نہایت مختصر طور پر کیا گیا ہے۔ یہ الغ خاں اعظم کی بیٹی تھیں جو بعد میں سلطان غیاث الدین بلبن کے نام سے مشہور ہوئے۔ بہر حال یہ بات ثابت ہے کہ سلطان ناصر الدین کی یہ مثالی اہلیہ شاہی خاندان کی چشم و چراغ تھی اور اس نے شہزادیوں کی طرح بڑے ناز و نعم اور لاڈ پیار سے پرورش پائی۔ اس کے والد اپنی نیک سیرت بیٹی کو بہت چاہتے تھے اور اس کے بلند اوصاف سے بہت متاثر تھے۔ جب شمس الدین التمش کے بعد ناصر الدین محمود ہندوستان کے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے تو ان کی شادی اسی خاتون سے ہو چکی تھی۔ غیاث الدین بلبن نے بیاہ کے وقت سات کروڑ روپے کا بیش قیمت جہیز اپنی ہونہار لڑکی کو دیا۔ اور بڑی دھوم دھام اور شاہانہ شان و شوکت سے رخصت کیا۔ تاریخ ہند میں سلطان ناصر الدین کو بنو امیہ کے مشہور درویش خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کا ہم مرتبہ خیال کیا

لہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور فرشتہ نے لکھا ہے کہ التمش نے اپنی لڑکی کی شادی بلبن سے کردی اور بعد میں بلبن نے اپنی ایک لڑکی ناصر الدین محمود سے بیاہ دی۔

جاتا ہے۔ وہ نہایت رحمدل، منصف مزاج، عادل اور عفو و کرم کا پیکر تھے۔ ان میں مطلق العنان حکمرانوں کی سی کوئی بات نہ تھی۔ وہ تاجدار اقلیم ہند ہوتے ہوئے بھی انتہائی خدا پرست، نیک دل، زاہد و عابد اور ہر لحظہ خدا سے ڈرنے والے درویش منش انسان تھے۔ چونکہ ناصر الدین کی ذاتی آمدنی بے حد قلیل تھی اس لئے وہ اپنی روٹی خود کما کر کھاتے تھے۔ وہ قرآن مجید لکھ کر اور ٹوپیاں کاڑھ کر بسر اوقات کرتے۔ شاہی محل ہر قسم کے سامانِ عیش و عشرت اور اسباب آرائش و زیبائش سے بالکل خالی تھا۔ امور سلطنت سے فراغت کے بعد بادشاہ کا تمام وقت محنت مشقت اور زہد و عبادت میں بسر ہوتا تھا۔ شادی سے قبل ملکہ نے لاڈلی شہزادیوں کی طرح پرورش پائی تھی مگر ملکہ کا خطاب پاتے ہی زندگی آرام و سکون اور راحت و مسرت کے لوازمات سے یکسر محروم ہو گئی۔ بادشاہ کے شاہی محل میں ایک بھی لونڈی یا کنیز نہ تھی۔ اس لئے ملکہ کو کئی قسم کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ گھر کے تمام کام کاج اپنے ہاتھ سے انجام دیتی تھی بلکہ جھاڑ پونچھ اور معمولی صفائی کا کام بھی ملکہ کو خود ہی کرنا پڑتا تھا اور اسے ایک لمحہ کے لئے فرصت نصیب نہ ہوتی تھی۔ ذرا سوچئے کہ اتنے بڑے باپ کی بیٹی کو ایسے ماحول میں اپنے درویش صفت اور غریب طبع خاوند سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ ان حالات میں ایک زاہد و عابد خاوند کے ساتھ ایک معمولی لڑکی کے لئے زیادہ دیر تک ساتھ دینا مشکل ہو جاتا ہے۔

آپ کے لئے شاید یہ بات باعث حیرت ہو کہ ان تمام باتوں کے باوجود ملکہ کو سلطان ناصر الدین سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ انتہائی نیک سرشت اور بے نظیر بیوی تھی۔ سلطان کو اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلاتی، خود ان کا بستر بچھاتی اور نصف رات تک ان کے پاؤں دبانے میں مصروف رہتی۔ آج ہماری معمولی عورتیں بھی گھر کے کام کاج کو مردوں کی غلامی سے تعبیر کرتی ہیں اور ان کے لئے اپنے آپ کو سنبھالنا بھی مشکل ہوتا

مگر سلطان ناصر الدین کی یہ قابلِ فخر بیوی ان کے کپڑے تک خود دھوتی تھی۔ وہ خود ہی برتن صاف کرتی تھی اور دنیا اسے ملکۂ ہند کے نام سے یاد کرتی تھی۔ ایک دن اتفاق سے روٹی پکاتے ہوئے اس نازک اندام ملکہ کے ہاتھ بری طرح جل گئے۔ پھپھولوں کی تکلیف برداشت نہ ہو سکی تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ نکلے اور حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ خدا نے اس تو شہنشاہ کی بیوی بنایا ہے مگر کام کے لئے ایک کنیز بھی نہیں دی سلطان سامنے بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف تھے۔ ملکہ کو اس طرح زار و قطار روتے دیکھ کر وجہ پوچھی۔ ملکہ نے بڑے ادب سے کہا کہ جہاں پناہ! ہاتھ جل گئے ہیں تکلیف ناقابلِ برداشت ہے۔ اگر ایک کنیز عنایت فرما دیں تو بڑی مہربانی ہوگی اگر یہ ممکن نہیں تو مجھے کوئی شکایت نہیں۔ میں اپنی حالت پر مطمئن اور راضی ہوں سلطان نے جواب دیا۔ بیگم! میں ہر وقت آخرت کے خوف سے بے تاب رہتا ہوں۔ اگرچہ میں اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوں۔ مگر دنیا میں عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سے نیک، خدا ترس اور دیانت دار لوگ طرح طرح کے مصائب و آلام میں مبتلا رہتے ہیں۔ مگر بے حیا اور بدطینت لوگ جو ہر وقت گناہوں اور عیوب میں غرق رہتے ہیں دنیا میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر اس سے انکار ممکن نہیں کہ موت کے بعد دوسری زندگی یقینی ہے۔ وہاں ہر نیک و بد کو اس کے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ اگر ہم نے اس چند روزہ فنا پذیر زندگی میں اپنی خواہشات کی پیروی نہ کی تو خدا کے حضور میں شرمسار نہیں ہونا پڑے گا۔

یاد رکھو! بلند مرتبہ لوگوں کی ادنیٰ سی بھلائی دوسروں کی بھلائیوں سے اور ادنیٰ سی برائی دوسروں کی برائیوں سے زیادہ بھاری ہیں۔ تم ایک نیک دل عورت ہو اس لئے صبر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ہم خدا کی ناشکری کے جرم میں پکڑے جائیں۔ تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ میں رعیت کا نگہبان اور محافظ ہوں مجھے اپنے فرائض کی انجام دہی

سے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ مزدوری کرتا ہوں مگر اجرت بہت کم ملتی ہے۔ لونڈی کیسے خریدوں۔ سلطنت کا خزانہ، رعایا کی فلاح و بہبود اور ان کی حفاظت پر صرف ہوتا ہے۔ اس پر نہ میرا حق ہے اور نہ تمہارا۔ میں تمہاری خاطر کیسے خیانت کر سکتا ہوں۔ اگر رعایا کی ہر عورت کو یہ سہولت مل سکے تو میں تمہیں بھی کنیز مہیا کر سکتا ہوں۔

نیک نفس بیوی نے اظہارِ ندامت کے طور پر خاموشی سے سر جھکا لیا اور پھر بڑے ادب سے کہا۔ عالیجاہ! میرا مقصد ہرگز شکایت کرنا نہ تھا بلکہ اضطراب کے عالم میں یہ گستاخی سرزد ہوئی ہے۔ آپ کے ہوتے مجھے دنیا کی کسی نعمت کی ضرورت نہیں۔ میں ہر حال میں خوش و خرم اور اللہ سے اپنی غلطی کے لیے معافی کی خواستگار ہوں۔

اگرچہ طبقات ناصری کے انگریز مترجم ریورٹی نے ان واقعات کی بناء پر چند مفروضات قائم کر کے شبہ کا اظہار کیا ہے مگر تاریخی حقائق کے سامنے اس کے مفروضات تنگ نظری اور تعصب کے سوا اور کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

سلطان ناصر الدین محمود وہ بادشاہ تھا جس کا دل شرابِ معرفت اور یادِ الٰہی کے نشے میں سرشار رہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتنی محبت تھی کہ وضو کئے بغیر نام لینا پسند نہ تھا۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ وہ وضو سے نہ تھے اور انہوں نے ایک سرکاری ملازم محمد کو بلانا چاہا مگر اسے تاج الدین کہہ کر پکارا۔ خادم نے حاضر ہو کر حیرت سے پوچھا کہ حضور! آج آپ نے خلافِ معمول مجھے تاج الدین کے نام سے کیوں یاد فرمایا ہے تو جواب دیا کہ بھئی اس وقت بے وضو ہوں۔ ایسی حالت میں تمہارا مقدس نام کیسے لے سکتا ہوں۔

ایسے شخص کے حرم میں اس فرشتہ خصلت ملکہ کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ نیک اور وفا شعار بیوی بھی اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کے

گھروں میں فرشتوں کا تقدس اور حوروں کی پاکیزگی نیک بیویوں کی صورت میں جلوہ افروز ہو۔ ایسے گھرانے ہمیشہ کردار و سیرت کے نور سے منور رہتے ہیں۔

مسلمان عورت کے لئے دنیا میں ایسا ہی کردار آئینے کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج کے دور میں ہم اس عورت سے مخاطب ہیں جو نہ کسی بادشاہ کی بیٹی ہے اور نہ کسی سلطنت کی ملکہ ہے۔ مگر پھر بھی کبر و نخوت کی نحوست ہر وقت اس پر چھائی رہتی ہے۔ وہ اپنے خاوند کے عمر بھر کے احسانات اور زندگی بھر کی خدمات کو ایک لمحہ میں فراموش کر دیتی ہے۔ اس وقت وہ احسان فراموشی اور ناشکری کا چلتا پھرتا مجسمہ نظر آتی ہے خاوند کے اچھا یا برا ہونے کا اس کے نزدیک ایک ہی معیار ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک اس کی خواہشات کی پیروی کرتا ہے۔ حالانکہ اسلام میاں بیوی دونوں کو اپنی نفسانی خواہشات کی غلامی سے آزاد ہو کر اللہ کی رضا پر کاربند رہنے کا سبق دیتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ملوکیت اور شہنشاہی کا منحوس دور تھا مگر اس وقت بھی ایسی نیک اور پاک سیرت خواتین موجود تھیں جو بظاہر شہزادیاں تھیں مگر ان کی سادگی، صبر و توکل قناعت اور نیک نفسی درویشی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ وہ ہر آزمائش کی کسوٹی پر پورا اترتی تھیں۔

کیا آج ایک غریب اور مفلس عورت بھی صبر و توکل کے معاملے میں ہندوستان کی اس ملکہ کا مقابلہ کر سکتی ہے؟ اگر نہیں تو ہمیں سوچنا چاہیئے کہ وہ کون سا جوہر حیات تھا جسے گم کر دینے کے بعد آج ہم ایک سچے مسلمان کی تمام خصوصیات اور اوصاف سے محروم ہو چکے ہیں۔

رضیہ سلطانہ

رضیہ بزرگ، عقلمند، عدل شعار، مخیر
اور کریم ہونے کے علاوہ علم دوست،
رعیت پرور، جفاکش، بہادر، رحمدل اور
غریب نواز تھی (منہاج السراج)

رضیہ سلطانہ

سلطان شمس الدین التمش نے ۶۳۶ھ میں وفات سے قبل اپنی بڑی بیگم کی صاحب زادی رضیہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔

کہتے ہیں کہ جب رضیہ کو جانشین نامزد کیا گیا تو اسی زمانے میں بابا فرید شکر گنج اپنی لڑکی شریفہ کو اپنا خلیفہ بنانے کے متعلق سوچ رہے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر کچھ اور عورتیں اس طرح کی ہوتیں تو عورتیں مردوں پر سبقت لے جاتیں۔ اگر عورت کو خلافت اور مشائخ کا سجادہ دینا مناسب ہوتا تو میں بی بی شریفہ کو دیتا۔

ترک امراء اور دوسرے درباریوں نے ایک نو عمر لڑکی کی اطاعت میں رہنا گوارا نہ کیا۔ اور التمش کی وفات کے بعد اسے ولی عہدی سے معزول کر کے رکن الدین فیروز کو تخت پر بٹھا دیا۔ مگر وہ بے حد نالائق اور عشرت پسند ثابت ہوا۔ خود لہو و لعب میں مصروف رہتا اور اس کی جابر اور ظالم ماں ترکان خاتون امور سلطنت انجام دیتی تھی۔ صوبوں کے حاکم اور بڑے بڑے امراء اس کے ظلم و تشدد سے تنگ آ گئے تو ہر طرف بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے۔

ترکان خاتون اور اس کے بیٹے رکن الدین فیروز نے رضیہ کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے اسے قتل کر دینے کی سازش کی جو خوش قسمتی سے کامیاب نہ ہو سکی۔ رضیہ ان دنوں مسجد قوت الاسلام کے قریب ایک محل میں رہتی تھی جو دہلی میں مشک فیروزی کے نام سے مشہور تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر رضیہ نے اپنی سوتیلی ماں کے مظالم کے

خلاف امرائے سلطنت سے امداد و اعانت کی درخواست کی۔ اسی اثناء میں پنجاب کے امراء نے رکن الدین کے خلاف بغاوت کردی۔ بادشاہ ان کی سرکوبی کے لیئے پنجاب روانہ ہوا تو بعد میں دہلی کے امراء نے بھی علم بغاوت بلند کر دیا اور واپسی پر امراء نے اسے گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اس کے بعد ۱۲۳۶ء میں رضیہ سلطانہ کو تخت پر بٹھایا گیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رضیہ اپنی سوتیلی ماں کے مظالم سے اس حد تک تنگ آچکی تھی کہ جب رکن الدین سلطنت سے باہر گیا تو ایک روز جب لوگ نماز جمعہ کے لئے جمع ہو رہے تھے رضیہ نے لوگوں کو اپنے عظیم المرتبت باپ التمش کی وصیت یاد دلائی اور ان سے امداد کی درخواست کی۔

یہ بھی مشہور ہے کہ رضیہ نے لوگوں سے وعدہ کیا کہ اگر اسے حکومت کرنے کا موقع دیا گیا اور اس کی حکومت مردوں سے بہتر ثابت نہ ہوئی تو بے شک اس کا سر قلم کر دیا جائے چنانچہ دہلی کے باشندوں اور امرائے سلطنت نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کر کے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ رکن الدین اور ترکان خاتون دونوں گرفتار کر لیئے گئے۔

مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ رضیہ امور حکومت پر بہت عبور رکھتی تھی۔ باپ نے اپنی زندگی ہی میں اسے اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا تھا اور فنون حرب میں ماہر بنانے کے لیئے بہترین اتالیق مقرر کیئے تھے۔ رضیہ کے عہد حکومت کے ایک بزرگ مؤرخ لکھتے ہیں کہ رضیہ بزرگ، عاقل، عدل گستر، رعیت پرور، علم دوست، نیک دل اور بہادر حکمران تھی۔ اور اس میں تمام شاہانہ اوصاف موجود تھے۔

رضیہ کی قابلیت اور صلاحیت کو دیکھتے ہوئے التمش مرحوم نے اپنے کئی بیٹوں کی موجودگی میں اسے اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔ ابتداء میں رضیہ سلطانہ پردے میں رہ کر تمام ملکی معاملات سرانجام دیتی رہی۔ اس نے اپنی قابلیت، لیاقت اور معاملہ فہمی کی دھاک بٹھا دی۔ یقیناً وہ ایک بے حد کامیاب حکمران ثابت ہوتی مگر امرائے دربار کی سازشوں نے

فتنہ انگیزیوں نے اسے ایک پل چین سے بیٹھنے کی مہلت نہ دی۔ رضیہ نے تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی ملک سے طوائف الملوکی، سرکشی اور فتنہ پروری کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنی خداداد لیاقت کی مدد سے دریائے سندھ سے لے کر خلیج بنگالہ تک پوری مملکت میں امن و امان قائم کیا۔ مگر جلد ہی ترک امراء اور فوجی افسروں نے رضیہ کے خلاف فتنے اٹھانا شروع کر دیئے۔

اپنے خاندان کی حکومت کو خطرے میں دیکھ کر رضیہ سلطانہ کو مجبوراً پردے سے باہر آنا پڑا تاکہ وہ ان سرکش اور مغرور ترک امرائے سلطنت کو محسوس کرا دے کہ رضیہ ایک کمزور پردہ دار عورت نہیں جو ان کے ہاتھوں میں کٹ پتلی کی طرح کھیلنے پر آمادہ ہو سکے گی بلکہ وہ سلطان شمس الدین التمش کی بیٹی ہے جو مردوں کی طرح ڈٹ کر ان کی سازشوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ مگر یہ حکمت عملی رضیہ کے زوال کا باعث ہوئی کیونکہ دشمنوں نے اس کی بے پردگی کو خوب خوب اچھال کر ہر طرف بدنام اور رسوا کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ دہلی کے لوگ رضیہ کے عدل و انصاف اور بلند کردار کے گرویدہ تھے اس لیئے وہاں کوئی سازش کامیاب نہ ہو سکی۔ چنانچہ دشمن امراء نے ملک عزالدین کبیر خاں حاکم لاہور کو اکسا کر بغاوت کرا دی۔

سنہ ۱۲۴۰ء میں رضیہ خود مقابلے کے لیئے میدان جنگ میں نکلی۔ ملک کبیر خاں شاہی فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور اس نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔ اس فتنے کی سرکوبی کے بعد ابھی وہ دہلی واپس پہنچی ہی تھی کہ ملک اختیار الدین حاکم بھٹنڈا نے بغاوت کر دی۔ رضیہ فی الفور بغاوت فرو کرنے کے لیئے بھٹنڈا پہنچی مگر جنگ شروع ہونے سے قبل ہی شاہی فوجوں میں پھوٹ پڑ گئی اور رضیہ کا وفادار جرنیل امیر جلال الدین یاقوت قتل کر دیا گیا۔ سازشی امراء نے فوراً رضیہ کو گرفتار کر کے ملک اختیار الدین التونیہ کے سپرد کر دیا۔ رضیہ کے لیئے یہ بات بیحد تکلیف دہ تھی کہ وہ ایک ایسے شخص کی قیدی بن کر رہے

جو ایک معمولی غلام تھا اور اس کے باپ التمش نے اسے آزاد کر کے اس بلند منصب تک پہنچایا تھا۔

ادھر دہلی کے با اثر امراء نے اس سازش کے بانی ملک اتیگن کے اشارے پر التمش کے تیسرے فرزند بہرام شاہ کو تخت پر بٹھا دیا اور خود نائب السلطنت بن گیا۔ مگر بہرام نے جلد ہی اسے قتل کرا دیا۔ اس وقت رضیہ سلطانہ بھٹنڈے کے قلعے میں قید تھی اور ملک التونیہ کی تمام امیدیں حالات بدلتے ہی خاک میں مل گئیں۔ اسے اس بغاوت کے صلے میں کچھ نہ ملا تو اس نے رضیہ سلطانہ سے باقاعدہ مجبور کر کے شادی کر لی اور اگست ۱۲۴۰ء میں فوج جمع کر کے دہلی پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں التونیہ اور رضیہ کو شکست فاش ہوئی اور وہ دونوں ایک نواحی جنگل میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ رضیہ کی قبر دہلی میں بلبلی خانہ کے اندر بتائی جاتی ہے اور اب یہ قبر رجی بجی کی خانقاہ کے نام سے مشہور ہے۔

بعض مورخین نے رضیہ سلطانہ کے کردار پر ناروا حملے کئے ہیں اور امیر جمال الدین یاقوت کا نام لے کر اس پاک دامن خاتون کو بدنام کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ حالانکہ اس دور کے تمام تذکرے ان خرافات سے بالکل خالی ہیں۔ اس قسم کے تمام واقعات رضیہ کی وفات سے کم و بیش چار سو سال بعد لکھے گئے ہیں۔ جو ہرگز مستند نہیں ہیں۔

برطانوی دور حکومت میں کئی مورخین نے صدیوں بعد لکھے ہوئے تذکروں طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ وغیرہ پر انحصار کر کے اس افسانے کو خوب اچھالا اور رضیہ ایسی باعصمت خاتون پر بدنامی کا پردہ گرا دیا۔ اس طرح ابن بطوطہ نے بھی ان سنی سنائی باتوں کو اپنے سفر نامے میں نقل کر دیا۔ اس افسوسناک حرکت میں ہندو مصنفین پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے زیب النساء ایسی پاکیزہ کردار عورت

کی طرح رضیہ کو بھی ایک گھٹیا عشق کے افسانے کی ہیروئن بنا کر پیش کیا اور اس طرح رضیہ کے حقیقی خدوخال چھپا دیئے۔

رضیہ کے ہم عصر مؤرخ منہاج السراج کا بیان ہے کہ رضیہ پردہ کرنے کے بعد ہمیشہ ہاتھی پر سوار ہوتی تھی اور یاقوت اس کی تخت نشینی کے وقت ایک باعزت درباری تھا جسے رضیہ نے محض ترکوں کا زور توڑنے کے لیئے آگے بڑھایا تھا تاکہ درباری امراء میں توازن اقتدار قائم رہ سکے اور وہ کبھی حکمران کو بے بس و مجبور کھلونا نہ بنا سکیں۔ اس کے عہد میں جتنے افسوسناک واقعات پیش آئے۔ ان کی ذمہ داری رضیہ کے کردار پر ہرگز عائد نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذمہ دار ہوس پرست ترک امراء تھے۔

رضیہ نہایت دلیر اور بہادر عورت تھی۔ اپنے عہد میں وہ عدل و انصاف کا نشان خیال کی جاتی تھی۔ اپنے عہدِ حکومت میں بھی اس نے صوم وصلوٰۃ کی پابندی ترک نہیں کی۔ اس نے محتاجوں، فقراء اور مساکین کا ایک رجسٹر تیار کرا رکھا تھا جس کے مطابق انہیں ہر قسم کی امداد و اعانت ملتی تھی۔ اس کے دورِ حکومت میں ملک بہت خوشحال تھا اور اس نے رفاہ عامہ کے کئی اچھے کام انجام دیئے۔

اگرچہ رضیہ سلطانہ ایسی عظیم عورت کو وقت اور حالات نے ایک ایسی کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا جس کا مایۂ خمیر ہی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے اٹھایا گیا تھا تاہم اس نے اپنی مستقل مزاجی اور فراست سے تاریخ میں اپنے لیئے ایک باعزت مقام پیدا کر لیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر رضیہ سیاسی جھمیلوں میں گرفتار ہو کر امورِ سلطنت انجام دینے کی ذمہ داری قبول نہ کرتی تو اس کی بے پناہ قابلیت صلاحیت اپنی عظمت کا لوہا منوانے کے لیئے کوئی دوسرا راستہ نکال لیتی۔ رضیہ کی زندگی میں جہاں بہترین کردار کی جھلک نظر آتی ہے وہاں ہماری خواتین کے لیئے عبرت کا سبق بھی پوشیدہ ہے جسے ہر سلیم العقل خاتون اچھی طرح سمجھ سکتی ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

چوچک بیگم

چوچک بیگم

ایثار و وفا کا وہ مہکتا ہوا پھول جس کی عنبر بار نکہت سے آج بھی آئینِ وفا کے اوراقِ گلستاں بکنار دکھائی دیتے ہیں۔ ایک وفادار شہزادی جس نے غربت و افلاس کے عالم میں بھی اپنے اندھے شوہر کا ساتھ نہ چھوڑا۔

چوچک بیگم

میرزا شاہ حسین حاکم سندھ کی نورِ نظر تھی۔ سندھ کے تاریخی شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئی جب سرزمین ہند پر شہنشاہ بابر کا پرچم لہرانے لگا۔ اور بے شمار لوگ مطیع فرمان بردار ہو گئے تو سندھ کے حاکم میرزا شاہ حسین نے مغلیہ خاندان سے اپنے تعلقات استوار کرنے کے لیئے اپنی بیٹی چوچک بیگم کی شادی بابر کے بیٹے کامران میرزا سے کر دی۔ بابر کی وفات کے بعد ہمایوں تخت نشین ہوا تو اس کے دونوں بھائیوں عسکری اور کامران میرزا نے اسے تاج و تخت سے محروم کرنے کے لیئے کئی شورشیں برپا کیں۔ ہمایوں نے پہلے تو ان دونوں کو نرمی اور احسان و مروّت سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی مگر جب یہ کسی صورت فتنہ انگیزیوں سے باز نہ آئے تو تنگ آکر اس نے دوبارہ قبضہ کے بعد ۹۶۰ھ میں کامران کو اندھا کر دیا تاکہ وہ عملی طور پر سازش میں شریک نہ ہو سکے۔ عتابِ شاہی نازل ہونے اور آنکھوں سے محروم ہونے کے بعد کامران کو عسرت وافلاس اور محتاجی نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ چنانچہ اس نے بھائی کی آنکھوں سے بہت دور حجازِ مقدس میں قیام پذیر ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ سفر حجاز پر روانہ ہونے سے قبل وہ سیدھا اپنے خسر میرزا شاہ حسین کے پاس ٹھٹھہ میں پہنچا تاکہ باقی زندگی اطمینان سے بسر کرنے کے لیئے وہ اپنے خسر سے امداد و اعانت حاصل کر سکے۔ شاہ حسین نے اس بے بسی اور محتاجی کے عالم میں اتنے طویل اور کٹھن سفر پر روانہ ہونے سے منع کیا، مگر کامران نے یہ کہہ کر خسر کا مشورہ

ماننے سے انکار کر دیا کہ اب میرا اس ملک میں رہنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے
چوچک بیگم نے جب اپنے شوہر کا عزم صمیم دیکھا تو وہ بھی ساتھ جانے کے لئے تیار
ہو گئی۔ جب شاہ حسین کو معلوم ہوا کہ اس کی نازپروردہ بیٹی بھی اس پر آشوب سفر پر روانہ
ہونے کا فیصلہ کر چکی ہے تو وہ سخت پریشان ہوا۔ اسی خدشہ کے پیش نظر اس نے
میرزا کامران کو بھی جانے سے منع کیا تھا۔ اپنی بیٹی کے اس فیصلے سے آگاہ ہوتے ہی
شاہ حسین نے شہزادی کو بلا کر ہر ممکن طریقے سے سمجھایا کہ وہ اس اندھے محتاج شخص کے
ساتھ غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ ترک کر دے۔ باپ نے چوچک بیگم
سے کہا کہ آخر تمہارے باپ کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ عیش و آرام ہے۔ مال و
دولت کی فراوانی ہے۔ دنیا کی ہر نعمت موجود ہے اور وہ عمر بھر شہزادیوں طرح
عیش و مسرت کی زندگی بڑے اطمینان سے بسر کر سکتی ہے آخر وہ کیوں کامران کے ساتھ
اپنی زندگی خراب کر رہی ہے جب کہ اس کا مستقبل بھی بالکل ختم ہو چکا ہے اور اب اس
کے سنبھلنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ مگر چوچک بیگم نے اپنا فیصلہ بدلنے سے صاف
انکار کر دیا۔ شاہ حسین یہ صورتِ حال دیکھ کر بہت مضطرب ہوا۔ چوچک بیگم کی ماں کا رو رو
کر برا حال ہو رہا تھا کیونکہ سب جانتے تھے کہ دوبارہ چوچک ان سے نہ مل سکے گی چنانچہ
باپ نے خاندان کے تمام لوگوں اور رشتہ داروں کو بلا کر کہا کہ وہ کسی نہ کسی طرح چوچک بیگم
کو کامران کے ساتھ نہ جانے پر آمادہ کریں مگر سب کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ اس وفاشعار
شہزادی نے اپنے اندھے خاوند کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا اور خاموشی سے
ماں باپ کو سلام کر کے کامران کے ساتھ روانہ ہو گئی۔
شاہ حسین کو امید تھی کہ شاید ساحلِ سمندر پر جا کر چوچک بیگم اپنے وطن اور عزیزوں اور
رشتہ داروں سے جدائی کی کلفت پوری طرح محسوس کرے گی اور واپس آ جائے گی مگر وہ
مجسمۂ ایثار و وفا سرزمینِ وطن کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی جہاز پر سوار ہو گئی

شاہ حسین نے پھر اپنے چند معتمد آدمیوں کو بھیجا کہ وہ چوچک بیگم کو اب بھی واپس آنے پر رضامند کر لیں۔ مگر انہیں پھر مایوسی ہوئی اور شہزادی اپنی ضد پر اڑی رہی آخر تنگ آ کر شاہ حسین خود جہاز پر پہنچا کیونکہ اس کی شفقتِ پدری اسے کسی کل چین نہ لینے دیتی تھی شاہ حسین نے بڑی نرمی اور لجاجت کے ساتھ اسے اپنے بڑھاپے کا واسطہ دیا اور اپنا فیصلہ بدلنے پر سخت مجبور کیا۔ باپ نے میرزا کامران سے بھی کہا کہ وہ ٹھٹھہ کے نواح میں اسے بڑی سے بڑی جاگیر دینے پر آمادہ ہے اور عمر بھر کے لئے اس کی کفالت بھی کرے گا بشرطیکہ وہ سفرِ حجاز کا ارادہ ترک کر دے۔ اگر وہ بہر صورت جانا ہی چاہتا ہے تو چوچک بیگم کو ساتھ لے جانے سے انکار کر دے اس کے عوض شاہ حسین اپنی استطاعت سے بڑھ کر مال و دولت دینے پر تیار تھا۔ کامران نے یہ معاملہ چوچک بیگم کی مرضی پر چھوڑ دیا اور کہہ دیا کہ میں نے پہلے بھی اسے مجبور نہیں کیا اور اب بھی میری طرف سے اسے اجازت ہے کہ وہ چاہے تو اپنے والدین کے پاس رہے۔ باپ پھر بیٹی کی طرف متوجہ ہوا اور اسے اپنا فیصلہ بدل دینے کے لئے کہا۔ چوچک بیگم نے جواب دیا۔

اے باپ! آپ کی حکم عدولی سے خود مجھے بھی بہت افسوس ہو رہا ہے۔ مگر میں مجبور ہوں میں کسی صورت اپنے مصیبت زدہ خاوند کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر میں نے ایسا کیا تو لوگ نہ صرف میرے منہ پر تھوک دیں گے بلکہ آپ کے معزز نام کو بھی بٹہ لگے گا۔ ذرا سوچئے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ شاہ حسین کی بے غیرت اور بے وفا بیٹی نے مصیبت کے وقت اپنے مجبور خاوند کو دغا دی اور اسے مصائب و آلام کے حوالے کر کے خود عیش و عشرت کی زندگی قبول کر لی۔ جب میرزا کامران خوشحال تھا اور اس کے بادشاہ بننے کی امید تھی تو آپ نے اپنی خوشی سے مجھے اس کے حوالے کر دیا۔ اب وہ خستہ حال اندھا، غریبی، افلاس اور مصائب و آلام میں گرفتار ہے اور اس وقت بھری دنیا میں کوئی اس کے ٹوٹے ہوئے دل کو تسلی دینے والا بھی نہیں

تو آپ اس سے جدا ہونے کا حکم دے رہے ہیں حالانکہ وہ میرا خاوند ہے۔ میں آپ ایسے غیرت مند باپ کی بیٹی ہوں میری رگوں میں آپ کا خون گردش کر رہا ہے۔ میں ایسے وقت میں اپنے خاوند کو چھوڑ دوں۔ مجھے بتایئے کہ یہ کس مذہب کی تعلیم ہے اور کون سے ملک کا قانون ہے کہ جب خاوند خوشحال اور صاحبِ اقتدار ہو۔ عورت اس وقت تو اس کی خوشیوں میں حصہ دار بنی رہے مگر جب اس کا ستارہ گردش میں آجائے اور دنیا کے سب لوگ اس کا ساتھ چھوڑ جائیں تو بیوی جو ایسے وقت پر خاوند کا واحد سہارا ہوتی ہے وہ بھی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لے۔ اپنی وفا شعار اور نیک دل بیٹی کی یہ گفتگو سن کر شاہ حسین کا دل بھر آیا اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے اب وہ بالکل لاجواب تھا۔ اس کے پاس کہنے کے لیئے کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ فرض شناس بیٹی نے اس کی غیرت و حمیت اور انسانیت کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی محبت میں اندھا ہو کر میاں بیوی کے راستے میں حائل ہو رہا تھا۔ آخر شاہ حسین نے بہت سی دولت اور ضروری سامان دے کر دونوں کو نم آلود آنکھوں سے رخصت کیا۔ یہ نیک دل عورت چار سال بعد ۹۶۴ھ میں حجاز میں انتقال کر گئی۔ وہ دوبارہ اپنے ماں باپ سے نہ مل سکی اور آخر دم تک اپنے اندھے خاوند کی خدمت میں مصروف رہی۔

چوچک بیگم کی یہ کہانی کتنی سادہ اور دل کو متاثر کرنے والی ہے۔ ہمارے دور کی معزز و محترم بیگمات اور بہنوں کو غور کرنا چاہیئے کہ شہزادی چوچک بیگم اور ان کے درمیان کون سی خلیج حائل ہے۔ چوچک بیگم اسی نسوانی جوہر کا دوسرا نام تھا جو عورت کو اوجِ ثریا کے لیئے باعثِ رشک بنا دیتا ہے۔ عورت کی بلندی اور عظمت کا راز اسی جوہر میں پوشیدہ ہے اور اسلام کی تعلیم اسی جوہر کو نمایاں کرتی ہے۔ اسی جوہر پہ مشرق ہمیشہ ناز کرتا رہا ہے۔ وفا و ایثار کا یہ جوہر مشرق کی عظمت اور ناموس کا امین

رہا ہے جس کی حفاظت کرنا ہر مسلمان عورت کا فرض ہے ۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ شہزادی چوچک بیگم کو کتنی بڑی آزمائش سے گزرنا پڑا ۔ اس کے ایک طرف پر آسائش اور عیش و آرام کی زندگی تھی ۔ ماں باپ اور عزیز و اقارب کی محبت کے بندھن تھے اپنے وطن کی الفت تھی ۔ دوسری طرف ایک ان دیکھی منزل ، مصائب و آلام سے بھرپور کٹھن سفر اور مفلسی کا مارا ہوا ، ایک محتاج اور بدنصیب اندھا خاوند تھا جو خود اٹھ کر پانی کے چند گھونٹ پینے کے قابل بھی نہ تھا ۔ اسے دو چیزوں میں ایک کو منتخب کرنا تھا ۔ مگر چوچک بیگم نے ایک مسلمان عورت کی طرح فرض کو محبت پر ترجیح دی ۔ اس نے اپنا مفلس اور اندھا خاوند چن لیا تو سب بیڑیاں اور زنجیریں کٹ کر گر گئیں ۔ پھر کوئی طاقت اس کا فیصلہ نہ بدل سکی ۔

خدا کرے کہ ہماری بہنیں چوچک بیگم کی زندگی سے بلند کرداری کا یہ سبق حاصل کریں اور مشرق کی ان مقدس روایات کے چراغوں کو اپنے خون سے روشن رکھیں تاکہ یہاں کبھی اندھیرا نہ پھیل سکے ۔

چاند بی بی

چاند بی بی ایک نیک دل، نیک نیت
مخلص، خدا ترس، عابدہ، پرہیزگار، سیاست
اور علم سپہ گری کی ماہر ملکہ تھی۔ خودداری اور شجاعت
اس کے دو بہت بڑے اوصاف تھے۔

چاند بی بی

چاند بی بی احمد نگر کے بادشاہ کی بیٹی تھی۔ اس کا تذکرہ مشہور مغل شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں ملتا ہے۔ چاند بی بی کی شادی بیجاپور کے والی سلطان علی عادل شاہ سے ہوئی لیکن تھوڑا عرصہ بعد سلطان عادل شاہ فوت ہو گیا اور چاند بی بی بیوہ ہو گئی۔ ادھر احمد نگر میں اس کا بھائی جو نظام شاہی خاندان کا حکمران تھا وفات پا گیا اور چاند بی بی کو اپنے نابالغ بھتیجے کی سرپرست بھی بننا پڑا۔ چنانچہ وہ بیجاپور سے احمد نگر واپس آ گئی اس وقت شہنشاہ اکبر کا ستارہ عروج پر تھا اور برصغیر پاک و ہند کے ہر گوشے میں اس کا پرچم اقبال لہرا رہا تھا۔ بنگال، پنجاب، سندھ، کابل، سرحد، سوات، کشمیر بلوچستان اور قندھار وغیرہ اس کی قلمرو میں شامل ہو چکے تھے۔ اب اس نے دکن کی طرف توجہ دی اور ۱۵۹۵ء میں شہزادہ مراد کو احمد نگر فتح کرنے کے لیے ایک لشکر جرار کے ساتھ روانہ کیا۔ برار پر پہلے ہی اکبر کا قبضہ ہو چکا تھا اور چاند بی بی نے اس کا دفاع ممکن نہ سمجھتے ہوئے اس پر مغلوں کا قبضہ تسلیم کر لیا تھا۔ مغلیہ فوج نے چاروں طرف سے احمد نگر کا محاصرہ کر لیا مگر چاند بی بی کی خود دار طبیعت نے اکبر کی اطاعت قبول کرنا گوارا نہ کیا اور وہ پاک و ہند کی اس عظیم الشان سلطنت سے ٹکرانے کے لیے کمربستہ ہو گئی۔ چند دن بعد مغل فوج نے قلعے پر خوفناک گولہ باری شروع کر دی جس سے قلعہ کی فصیل کا ایک حصہ منہدم ہو گیا۔ چاند بی بی بڑی جرأت اور شجاعت کے ساتھ اس شگاف کے سامنے کھڑی رہی اور تمام رات

وہاں موجود رہ کر اپنی نگرانی میں شگاف بند کرایا۔ اس نے قلعہ کی دیوار پر ہر جگہ توپچی متعین کر رکھے تھے جن کی کمان وہ خود کر رہی تھی۔ مشہور ہے کہ ایک موقع پر مغل فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے چاند بی بی کی محصور فوج کے پاس سیسہ کی گولیاں ختم ہو گئیں۔ تو چاند بی بی نے فوراً تانبے کی گولیاں بنانے کا انتظام کیا۔ جب وہ سٹاک بھی ختم ہو گیا تو سونے اور چاندی کی گولیاں تیار کرائیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس مقصد کے لئے چاند بی بی نے اپنا تمام زیور اور نقد روپیہ گولیاں ڈھالنے والوں کے سپرد کر دیا مگر شکست قبول نہیں کی۔ آخر حملہ آور فوج کو بری طرح سے پسپا ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا اور شہزادہ مراد نامرادی کے داغ سینے میں چھپائے واپس جانے پر مجبور ہو گیا تاریخ کی یہ بے نظیر فتح ایک اولوالعزم اور شیر دل عورت کی استقامت اور شجاعت کی زندۂ جاوید مثال ہے۔ ورنہ شہنشاہِ اکبر کی عسکری قوت کے سامنے چاند بی بی کی کیا حیثیت تھی۔ یہ صرف اس کا جذبۂ صادق تھا کہ اس نے اتنی بڑی طاقت کو ذلت آمیز شکست دے کر اکبرِ اعظم کا سر شرم و ندامت سے جھکا دیا۔

دوسری بار شہنشاہ اکبر نے شہزادہ دانیال کو اس مہم پر روانہ کیا۔ اس وقت احمد نگر اندرونی سازشوں کی آماجگاہ بن چکا تھا اور چاند بی بی کی فوج میں کئی نمک حرام پیدا ہو چکے تھے۔ اس کے کئی امراء جن میں وزیرِ سلطنت حامد خاں بھی شامل تھا بظاہر چاند بی بی کے وفادار تھے مگر در پردہ وہ برار پر مغلوں کا قبضہ تسلیم کرنے کی وجہ سے چاند بی بی کے دشمن بن گئے تھے۔ حامد خاں نے سلطانہ سے غداری کی اور ایک روز اپنے ہاتھ سے تلوار کا بھرپور وار کر کے اسے شہید کر دیا۔ دوسری مرتبہ جب شہزادہ دانیال نے حملہ کیا تو عزم و استقامت کی وہ مضبوط فصیل گر چکی تھی جسے لوگ چاند بی بی کے نام سے جانتے تھے۔ چنانچہ معمولی سی جھڑپ کے بعد احمد نگر مغل فوج کے حوالے کر دیا گیا۔

چاند بی بی کا کردار اگرچہ رضیہ سلطانہ کی طرح سیاسی حیثیت رکھتا ہے مگر ہمارا تعلق اس کی زندگی کے اس پہلو سے ہے جو حریت و حمیت، خودداری اور غیرت، شجاعت شہامت اور جرأت و استقامت سے عبارت ہے۔ یہی وہ بلند اوصاف ہیں۔ جن کی بدولت اس کی بے داغ سیاسی زندگی تاریخ کے صفحات پر منفرد انداز میں جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگر وہ ان اوصاف سے محروم ہوتی تو احمد نگر کی مختصر سی فوج چند گھنٹے بھی اکبری افواج کا مقابلہ نہ کر سکتی۔ اور تاریخ کے اوراق اس کے ذکرِ جمیل سے خالی ہوتے۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ چاند بی بی بہت دیندار اور خدا ترس خاتون تھی اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کرتی تھی۔

ملکہ نورجہاں

جس کے گرد رنگین قصوں اور دلچسپ رومانی کہانیوں
کا جال اس طرح بن دیا گیا ہے کہ اگر وہ اس وقت خود
زندہ ہوتی تو اپنے الف لیلوی کردار کو دیکھ کر اس کا سر
شرم وندامت سے جھک جاتا ـــــ اصل نور جہاں اس
افسانوی دنیا سے بہت دور رہتی ہے، وہ ایک وفا شعار
بہادر، دانش مند اور عفت مآب خاتون تھی۔ یہی وہ خاتون
تھی جس نے شہنشاہ جہانگیر کو شہرتِ دوام کی دولت
بخشی۔ جس نے تادمِ مرگ اپنے شوہر کی بڑی جانسوزی
سے خدمت کی اور اس کے مرنے کے بعد بھی پروانہ وار
اس کے مدفن کا طواف کرتی رہی اور اس کی یاد کو اس
طرح خشت و سنگ کے خوبصورت پیکر میں ڈھال دیا کہ
آج بھی ہزاروں ہاتھ اس کی مغفرت کے لئے اٹھتے ہیں
خاکِ لاہور پر جہانگیر اور نور جہاں کے مقبرے اس کی عصمت مآبی
اور پاک دامنی کا بہت بڑا ثبوت ہیں۔

ملکہ نور جہاں

نورجہاں کا اصل نام مہرالنساء تھا۔ اس کا ایرانی نژاد باپ غیاث بیگ اکبر کے عہد میں وارد ہندوستان ہوا۔ شہنشاہ اکبر نے غیاث بیگ کی قابلیت اور صلاحیت سے متاثر ہو کر شعبہ مالگزاری میں معقول مشاہرے پر ملازم رکھ لیا جہاں اس نے بڑا نام پیدا کیا۔ جب نورالدین جہانگیر تختِ حکومت پر متمکن ہوا تو اس نے غیاث بیگ کو اعتمادالدولہ کا خطاب دے کر وزیر مال مقرر کر دیا اور اس کے بیٹے آصف خاں کو بھی بہت بڑے عہدے پر مامور کیا۔ مہرالنساء جو بعد میں نورجہاں کے لقب سے مشہور ہوئی برصغیر کی تاریخ میں پہلی ملکہ ہے جسے بے پناہ شہرت نصیب ہوئی۔ اور کوئی شخص اس کے نام سے ناواقف نہیں رہا۔ یہ فقیدالمثال شہرت پاک و ہند کی کسی دوسری ملکہ کو کبھی نصیب نہیں ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر غیر ذمہ دار مؤرخین نے صدیوں بعد جو تذکرے سپردِ قلم کئے ان میں بے شمار ایسی سنی سنائی اور بے سروپا روایات کو جمع کر کے قصوں اور کہانیوں کی شکل دے دی جو کسی بھی تاریخی معیار کی کسوٹی پر پرکھنے سے جھوٹی ثابت ہو سکتی ہیں۔ ان جھوٹے افسانوں اور سینہ بسینہ منتقل ہونے والے رنگین قصوں نے عوام میں بڑی مقبولیت حاصل کی اور آخر دیارِ ہند کی اس مدبر علم دوست، وفا شعار اور بہادر خاتون کی شخصیت ان افسانوں میں گم ہو کر رہ گئی اور آج ہم اس الف لیلوی نورجہاں کو جانتے ہیں۔ جس کا ایک شرابی اور آوارہ منش بادشاہ سے ایسا تعلق تھا جسے جہانگیر کے باپ اکبر نے سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور

اور مہرالنساء کی شادی اپنے ایک سردار شیرافگن سے کر کے اسے بنگال کا صوبیدار مقرر کر دیا مگر وہ جہانگیر کے ایماء پر قتل کر دیا گیا۔ کیونکہ جہانگیر بدستور مہرالنساء سے تعلق قائم کئے ہوئے تھا۔ شیرافگن کی موت کے بعد جہانگیر نے نورجہاں کو اپنے حرم میں شامل کر لیا۔ یہ اور اسی قسم کے کئی بدنام قصے نورجہاں کی زندگی سے وابستہ ہیں جنہیں اگر تاریخی حقائق کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو یہ مبالغہ آرائی اور دروغ بافی کا ایک مکروہ گورکھ دھندا ثابت ہو جاتا ہے۔ جدید ترین تاریخی تحقیقات سے بھی یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ تذکرہ نگاروں کی تخلیق کی ہوئی یہ افسانوی نورجہاں حقیقی نورجہاں کا بالکل الٹ ہے۔ اس قسم کے جتنے مبالغہ آمیز قصے اس کی ذات سے منسوب کئے گئے ہیں سب من گھڑت اور بازاری جھوٹ ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اب یہ افسانے عالمگیر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اس مظلوم کی عصمت و عفت پر جو بہتان باندھے گئے ہیں انہیں حقیقت سمجھ کر پردۂ سیمیں پر بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ درحقیقت یہ تمام افسانے ان کے بہت بعد میں پیدا ہونے والے مورخین کی تخلیق ہیں۔ خصوصاً نورجہاں اور جہانگیر سے متعلق خفی خاں نے منتخب اللباب اور سجان رائے نے خلاصۃ التواریخ میں بہت غلط فہمیاں پھیلائی ہیں حالانکہ اقبال نامہ جہانگیری اور تزک جہانگیری ایسی کتب میں ان افسانوں کا کہیں ذکر نہیں۔

یہ درست ہے کہ مہرالنساء کی پہلی شادی علی قلی خاں عرف شیرافگن سے ہوئی جو ۱۶۰۷ء میں قتل ہو گیا۔ شہنشاہ جہانگیر ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہوا تو علی قلی خاں ان دنوں بردوان کا حاکم تھا۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ بنگال کے پٹھان سردار دور ہونے کی وجہ سے عموماً سرکشی پر آمادہ رہتے تھے۔ خصوصاً وہاں کا حاکم قطب الدین کوکہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتا تھا کہ وہ کسی طرح خودمختار سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ شہنشاہ جہانگیر کو حاکم بردوان علی قلی خاں عرف شیرافگن سے یہ توقع تھی کہ

وہ اس قسم کی سرکشی کو فوراً دبا دے گا۔ مگر شیر افگن دانستہ صورتِ حال کو نظر انداز کر رہا تھا بلکہ کچھ عرصہ بعد جہانگیر کو اطلاع ملی کہ وہ خود بھی بغاوت پر آمادہ ہے شہنشاہ نے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے قطب الدین کو ہی اس کام پر مامور کیا کہ وہ صحیح صورتِ حال سے دربار کو آگاہ کرے جب قطب الدین شیر افگن کی حدود میں پہنچا تو شیر افگن نے اس پر حملہ کر دیا۔ قطب الدین کے ساتھی بھی طیش میں آ گئے اور انہوں نے شیر افگن کو قتل کر دیا۔ جب جہانگیر کو ان دونوں کی موت کا علم ہوا تو اسے بہت افسوس ہوا۔ ان حالات میں جہانگیر پر یہ الزام لگانا کہ اس نے مہر النساء کے لئے شیر افگن کو قتل کیا، بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ مستند کتب تاریخ میں اس بات کا بھی کہیں ثبوت نہیں ملتا کہ جہانگیر نے مہر النساء کی بیوگی سے پہلے کبھی اسے دیکھا تھا۔ شیر افگن کے قتل کے بعد مہر النساء کے باپ اعتماد الدولہ نے اپنی بیٹی کو شہنشاہ اکبر کی بیوہ اور جہانگیر کی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم کے پاس خدمت گزاری کے لئے بھیج دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جہانگیر نے ۱۶۱۱ء میں مہر النساء کو پہلی مرتبہ جشن نوروز میں دیکھا۔ اس وقت شیر افگن کو مرے چار سال گزر چکے تھے۔ مہر النساء چونکہ بے حد حسین و جمیل، خوش اطوار، سلیقہ مند اور ذہین خاتون تھی۔ جہانگیر اس کی اچھی عادات اور عمدہ خصائل سے بہت متاثر ہوا۔ دو ماہ بعد شہنشاہ نے اس سے شادی کر لی۔ شادی کے موقع پر اسے نور محل اور بعد میں نور جہاں کا خطاب دیا گیا۔ یہ خطاب اب اس کا نام بن چکا ہے اور دنیا اسے مہر النساء کی جگہ نور جہاں کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جہانگیر سے نور جہاں کی شادی کا واقعہ قطعاً غیر معمولی اور پراسرار حالات کا نتیجہ نہ تھا جسے رنگ آمیزی کے ساتھ ایک رومانی افسانہ بنا دیا گیا ہے۔ اگرچہ شراب جہانگیر کی ایک کمزوری بن گئی تھی مگر وہ امرائے دربار اور رعایا کو اس لعنت میں گرفتار ہونے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ نور جہاں نے اس کے حرم میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس کی مے نوشی کی عادت کو قابو میں لانے کی

تدبیریں کرنے لگی ۔کثرت سے تلخ اور تیز شرابیں استعمال کرنے کی وجہ سے جہانگیر کی صحت خراب رہنے لگی تھی اور اس کا جگر بھی متورم ہوتا جا رہا تھا مگر نورجہاں ہر ممکن کوشش کرتی تھی کہ اگر شہنشاہ یہ عادت ترک نہیں کر سکتا تو کم از کم اعتدال پر قائم رہے وہ اس کے کھانے پر بھی کڑی نگاہ رکھتی تھی ۔ کیونکہ اسے جہانگیر کی صحت کا بہت خیال رہتا تھا۔

نورجہاں اپنی لیاقت اور دانشمندی کی بدولت جہاں گیر کے دل و دماغ پر اس طرح حاوی ہو چکی تھی کہ درحقیقت وہی سلطنت کے سیاہ و سپید کی مالک تھی مگر نورجہاں نے کبھی شہنشاہ کو دانستہ غلط رائے نہیں دی اور نہ کوئی ایسا اقدام کیا جس سے سلطنت کے استحکام کو نقصان پہنچنے کا خطرہ لاحق ہوتا ۔ یہی وجہ تھی کہ جہانگیر اسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ اور اس پر بے پناہ اعتماد کرتا تھا۔ میاں بیوی کی یہ باہمی محبت اور موانست ہی رنگا رنگ افسانوں کی وجہ بن گئی اور داستان پسند لوگوں نے اس کو کئی قسم کے قصوں میں منتقل کر دیا ہے۔

نورجہاں اس برصغیر کی پہلی ملکہ تھی جس کا نام شہنشاہ کے ساتھ رائج الوقت سکوں پر کندہ ہوا۔ اس سے پہلے یا بعد برصغیر پاک و ہند کی کسی ملکہ کو یہ عزت نصیب نہیں ہوئی اس کے علاوہ جہانگیر نے بھاری اشرفیوں کا نام ہی "نورجہانی" رکھا تھا۔ ۱۶۱۹ء میں نورجہاں نے فتح پور سیکری میں شکار کھیلتے ہوئے بندوق کی پہلی ہی گولی سے شیر کو مار ڈالا تو بادشاہ بہت خوش ہوا۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس سے نورجہاں کی شجاعت اور دلیری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ نورجہاں عقل و فراست اور ذہانت و دانش مندی میں اپنی مثال آپ تھی۔ اکثر انتہائی نازک مواقع پر اس نے ایسی حاضر دماغی اور دانشمندی کا ثبوت دیا کہ آج بھی سن کر حیرت ہوتی ہے۔ ایک دفعہ شہنشاہ اور ملکہ کابل جا رہے تھے۔ آصف خاں لشکر کا ایک بہت بڑا حصہ لے کر

دریا کے پار اتر گیا۔ مگر شہنشاہ جہانگیر اور نورجہاں تھوڑی سی فوج کے ساتھ پیچھے رہ گئے۔ مہابت خاں نے اپنے سپاہیوں کی مدد سے کشتیوں پر قبضہ کر کے جہانگیر کو حراست میں لے لیا۔ مگر ملکہ نورجہاں کسی طرح دریا کے پار پہنچ گئی اور آصف خاں کو مقابلے کے لئے بھیجا مگر اس نے شکست کھائی۔ نورجہاں نے بڑی عقلمندی اور ہوشیاری سے مہابت خاں کا زور توڑ دیا اور وہ ڈر کے مارے بھاگ گیا۔ اس طرح لائق ملکہ نے اپنے شوہر کو بچا لیا۔

۱۶۲۷ء میں جہاں گیر کی صحت بہت خراب ہو گئی ملکہ نورجہاں پہلے بھی ایک مرتبہ اسے کشمیر لے گئی تھی اور وہاں اسے کافی افاقہ ہو گیا تھا۔ اب دوسری بار وہ پھر جہانگیر کے ساتھ کشمیر گئی مگر جہاں گیر کے دن پورے ہو چکے تھے۔ اس لئے کوئی فرق نہ پڑا بلکہ بیماری شدت اختیار کر گئی۔ نورجہاں نے ان ایام میں اس کی بے پناہ خدمت کی۔ وہ ہر وقت تیمارداری اور دیکھ بھال میں مصروف رہتی تھی۔ مگر اب جہانگیر کی مسیحائی نورجہاں کے دائرہ اختیار میں نہ تھی۔ چنانچہ، نومبر ۱۶۲۷ء کو جہانگیر پیر پنجال کے قریب اس دارِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ نورجہاں ابھی اس صدمے سے سنبھلنے نہ پائی تھی کہ اس کے بھائی آصف خاں نے ملکہ کو حراست میں لے کر سازشیں شروع کر دیں۔ مگر اب نورجہاں کی دلچسپی کا کیا سامان باقی رہ گیا تھا۔ اس کی تمام عظمت و شوکت اپنے خاوند کے ساتھ رخصت ہو چکی تھی۔ اب وہ دوسروں کے رحم و کرم پر تھی۔ آصف خاں کی کوششوں سے شاہ جہان تخت پر بیٹھا اور اس نے نورجہاں سے بڑا اچھا سلوک کیا۔ اس نے فیاضی سے کام لیتے ہوئے نورجہاں کے لئے معقول پنشن مقرر کر دی۔ جہانگیر کی موت کے بعد نورجہاں کا دل دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ اس نے آخری عمر میں لاہور کے کسی علاقے میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ وہ بڑی سادہ اور خاموش زندگی بسر کرتی تھی۔ اسے وظیفہ کی جتنی رقم ملتی وہ سب صدقہ و خیرات اور

حاجت مندوں کی ضروریات کو پورا کرنے میں صرف کر دیتی تھی۔ قیامِ لاہور کے دوران اس کی ایک ہی مصروفیت ہوتی تھی، وہ اپنی ذاتی نگرانی میں شہنشاہ جہانگیر کا مقبرہ بنوانے میں مصروف رہتی تھی۔ پاکستان کی یہ خوبصورت عمارت اپنی دلکشی، دلآویزی اور حسن و جمال کے لئے نورجہاں کے پاکیزہ ذوق کی رہین منت ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے باپ اعتماد الدولہ کا مقبرہ بھی تعمیر کرایا جو اس کی تعمیری صلاحیتوں اور جدتوں کا زندہ ثبوت ہے۔ یہ مقبرہ نورجہاں کے حسین اور خوبصورت ذہن کی مکمل تصویر ہے جس کی نظیر پورے مغل فنِ تعمیر میں نہیں ملتی۔ جہانگیر کی وفات کے بعد نورجہاں اٹھارہ برس تک زندہ رہی مگر وہ اپنے لئے کوئی مقبرہ تعمیر نہ کرا سکی۔ آج وہ جہانگیر کے حسین و جمیل اور خوب صورت مقبرے کے پہلو میں ایک شکستہ حال اور بوسیدہ سی قبر میں دفن ہے جہاں قدم رکھتے ہی زندگی کی بے ثباتی کا احساس دل و دماغ کو بری طرح متاثر کرتا ہے۔ نورجہاں کی خاموش، تاریک اور ویران سی قبر سوچنے والوں کے لئے ایک درسِ عبرت ہے اور ان لوگوں کے لئے نشانِ ہدایت جو دنیا کی عظمت و شوکت اور چند روزہ زندگی کے قصرِ نازک کی آرائش و زیبائش کے لئے بڑے سے بڑے گناہ اور بدترین ذلت کو گلے لگا لیتے ہیں اور اس دن کو بھول جاتے ہیں جب وہ خود مٹ جائیں گے مگر ان کے گناہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

نورجہاں کی شاہانہ حشمت و شوکت تو قصۂ پارینہ بن کر تاریخ کے اوراق میں دفن ہو چکی ہے۔ مگر اپنے شوہر سے اس کی محبت، وفاداری اور خدمت گزاری آج بھی اس کے لئے دلوں میں احترام کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔

شہزادی زیب النساء

ایک زاہد و عابد باپ کی پرہیزگار اور
متّقی بیٹی جو علم و فضل کا سرچشمہ بن کر انسانی قلوب
کو سیراب کرتی رہی جو عصمت و عفت اور شرم و حیاء
کا پیکر بن کر زندہ رہی۔ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ
علیہ وسلم کی محبت جس کا زیورِ حیات تھی۔

شہزادی زیب النساء

زیب النساء نام تھا بعض روایات کے مطابق زبیدہ بیگم کے نام سے مشہور تھیں۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیرؒ کی لختِ جگر تھیں۔ عالمگیر کی ایرانی بیگم ولرس بانو بیگم کے بطن سے تھیں۔ صحیح تاریخ پیدائش کا تعین نہیں ہو سکا ایک غیر معتبر روایت کے مطابق پیدائش ۱۶۳۷ء کے لگ بھگ ہے۔

شہنشاہ عالمگیر نے اپنی ہونہار نورِ نظر کی تعلیم و تربیت کے لئے وقت کے مایۂ ناز علماء کو مامور کیا تھا۔ شہزادی نے کم سنی میں روشن آرا بیگم سے قرآن حفظ کیا۔ شہنشاہ عالمگیر نے جب اپنی معصوم اور ننھی بیٹی سے تلاوت کے ساتھ قرآن کریم سنا تو بے حد مسرور ہوئے اور زیب النساء کو تیس ہزار اشرفیاں انعام میں دیں۔ اس دور کے نامور عالم ملا جیون سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ملا جیون اورنگ زیب عالمگیر کے بھی استاد رہ چکے تھے شہزادی زیب النساء اعلیٰ پایہ کی خوشنویس تھیں وہ نستعلیق، نسخ اور شکست وغیرہ ہر قسم کے خطوط لکھنے میں مہارت تامہ رکھتی تھیں۔ شعر و ادب پر بھی بہت عبور حاصل تھا کیونکہ وہ خود ایک باکمال اور قادر الکلام شاعرہ تھیں۔ زیب النساء کے پاس ایک نہایت عمدہ لائبریری بھی تھی جس میں کئی بیش قیمت اور نادر علمی کتب تھیں۔ وہ لائبریری ان کے بلند علمی اور ادبی ذوق کی آئینہ دار تھی۔ وقت کے مشاہیر علماء اور شعراء ان کے آستانے پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ شہزادی زیب النساء کو علم و فضل سے اتنی زیادہ محبت تھی کہ انہوں نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ ان کی پاکیزہ اور بے داغ زندگی کے اس خلاصہ

سے بعض متعصب ہندو مؤرخین نے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس باعصمت پردہ نشین خاتون کو بدنام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ شہنشاہ عالم گیرؒ سے متعصب ہندو مؤرخین کو خداواسطے کا بیر ہمیشہ رہا ہے کیونکہ خاندان مغلیہ کا وہ پہلا اور آخری فرمانروا تھا جس نے شرعی احکام اور اسلامی اصولوں کو سیاسی مصلحتوں اور شاہی خود غرضیوں پر قربان کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ انہیں اسلام سے والہانہ عشق تھا۔ جہاں ان کی اپنی زندگی تقویٰ و طہارت سے مملو تھی وہاں وہ امور سلطنت میں بھی شعائر اسلامی کو دوسری تمام باتوں پر فوقیت دینے کے عادی تھے۔ شہنشاہ عالم گیر کا یہی قصور تھا جو ہندوؤں کے نزدیک آج تک ناقابلِ معافی ہے۔ انہوں نے موحد ہوتے ہوئے ان کے معبدوں اور بت خانوں میں حاضری نہیں دی اور ان کی مشرکانہ رسوم میں شرکت نہیں کی۔ انہوں نے دربارِ شاہی اور قصرِ حکومت کو ہر قسم کے سامانِ لہو و لعب سے پاک کر دیا۔ اور حکومت کو صحیح اسلامی رنگ دینے کی کوشش میں زندگی صرف کر دی۔ اسی وجہ سے ہندو مؤرخ انہیں تنگ نظر کٹر مذہبی متعصب اور ہندو جاتی کا دشمن بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اسی ذہنی عداوت اور مخاصمت کی وجہ سے شہنشاہ کی عفیفہ اور پاکباز بیٹی ان مؤرخین کی بے بنیاد افسانہ طرازیوں کا شکار ہوئی اور ان بداندیشوں نے اس زاہدہ اور عابدہ خاتون کو زبردستی ایک شخص عاقل خاں سے وابستہ کر کے بدنام کرنے کی کوشش کی جسے ایک انصاف پسند ہندو مؤرخ مسٹر جادو ناتھ سرکار نے پوری طرح بے نقاب کیا ہے۔ انہوں نے مستند تاریخی حوالوں سے اس کذب بیانی کی واضح الفاظ میں پرزور تردید کی ہے۔ پٹنہ کالج کے اس مشہور مؤرخ نے تیس برس کی مکمل تحقیق کے بعد شہزادی زیب النساء کے متعلق لکھا ہے کہ شہزادی سے متعلق یہ ناپاک افسانے انیسویں صدی کے اردو افسانہ نگاروں کی اختراع و ایجاد ہیں ورنہ عاقل خاں کا یہ واقعہ کسی مستند اور قابلِ اعتماد تاریخ میں مذکور نہیں بلکہ تاریخی شواہد سرے سے اس کی نفی کرتے ہیں حتیٰ کہ مغربی مؤرخین نے بھی جو کوئی ایسا موقع ہاتھ

نہیں جانے دیتے کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ اس کے برعکس تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ شہزادی زیب النساء انتہائی نیک، خدا پرست، پابند شریعت، اور عبادت گزار تھیں۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ علمی مصروفیات اور زہد و عبادت میں بسر ہوا ہے۔ شہنشاہ عالمگیرؒ ان کے اعلٰے اوصاف اور بلند کرداری کی وجہ سے انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ اپنی دیندار اور عالمہ بیٹی پر فخر کیا کرتے تھے۔ قصرِ شاہی میں صرف زیب النساء کو یہ غیر معمولی اہمیت اور حیثیت حاصل تھی کہ شہنشاہ ان کے مشوروں کو بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی اصابتِ رائے کی تعریف کرتے تھے۔ شہزادی اربابِ علم و فضل کی بہت قدر دان تھیں اور انہیں خطیر رقوم انعام میں دیا کرتی تھیں۔ دیگر زبانوں کی تصانیف کے تراجم ان کا محبوب علمی شغل تھا۔ ان تراجم میں "زیب التفاسیر" بہت مشہور ہے۔ یہ قرآن مجید کی مشہور تفسیر "تفسیر کبیر" کا ترجمہ ہے۔ اصل کتاب امام فخر الدین رازی کی تصنیف ہے۔ شہزادی زیب النساءؒ نے اس تفسیر کا ترجمہ کرنے وقت ملا شفیع الدین عرض بگی سے بہت مدد لی تھی۔

فی البدیہہ فارسی شاعری میں وہ بے مثل تھیں۔ ان کے اشعار بہت برجستہ اور اثر آفرین ہوتے تھے۔ بعض قدیم کتب میں کئی مقامات پر ان کے اشعار نقل کئے گئے ہیں جن سے شہزادی کی قادر الکلامی اور پختہ گوئی کی شہادت ملتی ہے۔ بازار میں ایک دیوان بھی ملتا ہے جو ان کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے مگر وہ تاریخی لحاظ سے مستند نہیں ہے۔

شہزادی زیب النساء کی دانش مندی اور ذہانت کا اندازہ کرنے کے لیئے ایک ہی واقعہ کا ذکر کافی ہے جب اورنگ زیب عالمگیرؒ نے دکن کے قطب شاہی اور عادل شاہی خاندانوں کو ختم کر کے ان کے علاقے سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیئے تو فتح کی خوشی میں ایک بہت بڑا جشن منعقد کیا۔ تمام امرائے دربار اور رؤسائے سلطنت

نے مبارکبادیں پیش کیں اور نذرانے گزارے لیکن شہزادی زیب النساء خاموش رہی معاً بادشاہ کو خیال آیا تو پوچھا کہ ہماری بیٹی زیب النساء نے ہمیں مبارکباد نہیں دی شہزادی نے حاضر ہو کر کہا کہ عالیجاہ! یہ کون سی خوشی کی بات ہے جو میں مبارکباد پیش کرتی۔ آپ پہلے شہنشاہ تھے ابوالحسن تانا شاہ اور سکندر عادل شاہ ایسے کئی بادشاہ آپ کے تابع فرمان تھے اور لقب شہنشاہ آپ کو زیب دیتا تھا۔ آپ نے ان سب کی حکومتیں ختم کر دی ہیں اور ان کے علاقے اپنی قلمرو میں شامل کر لیے ہیں اب آپ کا مرتبہ گھٹ کر صرف بادشاہ رہ گیا ہے۔ پہلے آپ ملک الملوک تھے اب صرف ملک رہ گئے ہیں۔ میں کس بات پر مبارکباد دوں۔ عالمگیرؒ شہزادی کا یہ جواب سن کر بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ زیب النساء جو کچھ کہتی ہے درست ہے۔

شہزادی نے تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ لاہور میں دفن ہوئیں ملتان روڈ پر سمن آباد سے ذرا آگے نواں کوٹ میں ایک شکستہ مقبرہ ان کا مدفن بتایا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس مقبرے کا فرش سنگِ مرمر اور سنگِ اسود کی نقاشی کا ایک نادر نمونہ تھا۔ مگر سکھوں کے عہدِ حکومت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے حضوری باغ میں بارہ دری کی تعمیر کے لئے اس مقبرے کے تمام قیمتی پتھر اکھاڑ لیے۔ لاہور میں میا بائی کا باغ بھی شہزادی زیب النساء کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

خدا کرے کہ ہماری مسلمان بہنیں اس نیک دل اور عصمت مآب شہزادی کے اچھے اوصاف کو اپنا سکیں تاکہ تاریخِ عالم اسی طرح ان کی عظمت اور بلند کرداری کے گیت گاتی رہے۔

عارفۂ ملت

شرف النساء بیگم

قلزم ما ایں چنیں گوہر نزاد
ہیچ مادر ایں چنیں دختر نزاد

ہماری قوم میں (شرف النساء) ایسی بلند کردار عورت شاید ہی کبھی پیدا ہوئی ہو اور کسی ماں نے شاید ہی ایسی بیٹی کو جنم دیا ہو

آں سراپا ذوق و شوق و درد و داغ
حاکم پنجاب را چشم و چراغ

یہ خاتون جو ہر وقت یادِ الٰہی میں مصروف رہتی تھی فقر و غنا اور عشق و شوق کا مجسمہ تھی پنجاب کے حاکم کی بیٹی تھی۔

تا ز قرآں پاک مے سوزد وجود
از تلاوت یک نفس فارغ نہ بود

اس کی زندگی کی تپش اور حرارت قرآن پاک سے تھی اور ایک لمحہ بھی تلاوتِ قرآن سے فارغ نہ رہتی تھی۔

در کمر تیغ دو رو قرآں بدست
تن بدن ہوش و حواس اللہ مست

اس کی کمر میں تلوار اور ہاتھ میں قرآن ہوتا تھا اور ہر وقت اللہ کی محبت سے سرشار اور بے خود رہتی تھی۔

خلوت و شمشیر و قرآن و نماز
اے خوش آں عمرے کہ رفت اندر نیاز

اس کی زندگی خلوت و تنہائی، تلوار، قرآن اور نماز سے عبارت تھی کیسی مبارک زندگی تھی جو اللہ کی محبت میں بسر ہو گئی۔

بر لب او چوں دمِ آخر رسید
سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید

جب اس کا دمِ آخریں قریب آیا تو اس نے بڑے اشتیاق کے ساتھ ماں کی طرف دیکھا۔

گفت اگر از رازِ من داری خبر
سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر

اور کہا آپ کو میری زندگی کے راز کا علم ہے تو اس تلوار اور قرآن مجید کی طرف دیکھیے۔

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند

یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی محافظ ہیں اور مسلمان کے لیے زندگی کا محور یہی دو چیزیں ہیں۔

وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن
تیغ و قرآں را جدا از من مکن

آپ سے رخصت ہوتے وقت میں صرف اپنی اس خواہش کا اظہار کرنا چاہتی ہوں کہ اس تلوار اور قرآن کو مجھ سے جدا نہ کریں اور میرے مرنے کے بعد بھی میرے ساتھ رہنے دیں

مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

مجھے اپنی قبر کے لیے کسی عالیشان مقبرے اور گنبد کی ضرورت نہیں، میری تربت کے لیے یہی سامان کافی ہے کیونکہ مومن کو تلوار اور قرآن کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(اقبال)

عارفۂ ملت شرف النساء بیگم

اٹھارھویں صدی کے اوائل میں جب کہ دولت مغلیہ کی عظمت و سطوت کا آفتاب تیزی سے غروب ہو رہا تھا اور ہر طرف زوال و انحطاط کے منحوس سائے رینگ رہے تھے پنجاب کے وائسرائے نواب عبدالصمد خاں کے گھر میں اپنے دور کی یہ عظیم ترین اور رفیع الشان خاتون پیدا ہوئی جس کی عارفانہ اور مقدس زندگی کے نور سے خاک پنجاب کا ہر ذرہ رشک قمر بن کر چمکنے لگا۔ شرف النساء بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ آپ کے والد نواب عبدالصمد شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں بخارا سے ہجرت کر کے دلی آ گئے۔ شہنشاہ نے اس یگانۂ روزگار ہستی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑی قدر و منزلت سے پیش آئے۔ نواب عبدالصمد اپنی قابلیت اور لیاقت کی بدولت بہت جلد ترقی کر کے پنج ہزاری کے منصب پر پہنچے۔ سیف الدولہ اور دلیر جنگ کے خطابات حاصل کئے۔ آپ اعتماد الدولہ محمد امین خاں بہادر کے ہم زلف تھے اور خواجہ عبیداللہ احرار کی اولاد سے ہونے کے باعث گھرانے کے سب لوگ بے حد دیندار متشرع اور خدا پرست تھے۔

۱۷۱۳ء میں فرخ سیر نے نواب عبدالصمد کو پنجاب کا وائسرائے مقرر کر کے بھیجا۔ کیونکہ سکھوں کے ایک مذہبی گورو بندہ بیراگی نے پنجاب کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اور انہیں لرزہ خیز مظالم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ نواب عبدالصمد نے آتے ہی اکتوبر ۱۷۱۳ء میں سکھوں کا مرکز لوہ گڑھ فتح کر لیا۔ اور بندہ بیراگی شکست کھا کر پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ انہوں نے دو سال کے عرصے میں سکھوں کو پے در پے ذلت آمیز

شکستیں دیں مگر بندہ بیراگی گرفتار نہ ہو سکا۔ اپریل ۱۷۱۵ء میں نواب نے تیس ہزار فوج کے ساتھ اس کی گڑھی گرداس ننگل کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ آٹھ ماہ تک جاری رہا۔ آخر سکھوں نے بھوک سے تنگ آ کر ہتھیار ڈال دیئے اور بندہ بیراگی اسی سال دسمبر میں زندہ گرفتار ہو گیا جسے شرف النساء بیگم کے بھائی نواب ذکریا خاں عرف خان بہادر خاں سات سو چالیس قیدیوں کے ساتھ شہنشاہ کے حضور میں دلی لے گئے۔

شرف النساء بیگم کے خاندانی حالات اور اس وقت کی سیاسی فضا کو سامنے رکھتے ہوئے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس مخدرہ عصمت مآب نے کس قسم کے ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اگرچہ اس سلسلے میں مستند تاریخی روایات موجود نہیں ہیں کیونکہ نواب عبدالصمد کے دیندار خاندان کی خواتین پردہ کی سخت پابند تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس عہد کے مؤرخین ان کی مستور و محجوب عظمت اور آفتاب و ماہتاب کو شرما دینے والی درخشندگی کو تفصیل کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر منتقل نہ کر سکے۔ مگر اس خاندان کی عظیم ترین دوشیزہ شرف النساء بیگم کے بے نظیر کردار کی پاکیزہ روشنی ایسی تھی کہ حرم کی چاردیواری اسے چھپانے میں ناکام رہی اور اس کا نور چاندنی بن کر دنیائے قلب و نظر پر غیر محسوس طریقے سے اس طرح چھا گیا کہ آج بھی روح اس کی کیفیت آفرینی سے جھوم جھوم جاتی ہے۔ اگرچہ اس وقت شرف النساء کی بے ریا اور پاک زندگی کا اتھاہ خلوص ان کے اور عوام کے درمیان پردہ بن کر حائل رہا مگر ایک صدی گزرنے سے قبل ہی وقت کے ہاتھ نے اس پردے کو الٹ دیا اور کئی برسوں کے بعد حکیم مشرق حضرت علامہ اقبال کے معجز نگار قلم نے اس عارفۂ ملت کی سیرت کا ایک جلوہ دکھا کر دنیا کو حیرت زدہ کر دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر شرف النساء بیگم کی زندگی پوری تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے ہوتی تو آج یہ ثابت ہو جاتا کہ برصغیر پاک و ہند کی کوئی بڑی سے بڑی خاتون بھی اس کی عظمت کے سامنے گرد راہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

حالات و قرائن سے جو نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شرف النساء نے بچپن ہی سے اسلام کی ٹھوس اور بنیادی تعلیم حاصل کی تھی اور ان کی بصیرت کو قرآنی حقائق و معارف نے خوب روشن کر دیا تھا۔ حصولِ تعلیم کے سلسلے میں انہوں نے یقیناً صاحبِ دل اور حقیقت شناس اساتذہ سے فیض حاصل کیا تھا۔ گھر کی فضا ہر وقت ذکرِ الٰہی اور تسبیح و تحمید کے قدسی نغمات سے معمور رہتی تھی۔ وہ حب اللہ اور رسول کی بے پناہ محبت سے سرشار تھے احکامِ الٰہی کی پابندی انہیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب اور عزیز تھی۔ زندگی سادگی اور استغناء کی رعنائیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

شرف النساء کے باپ اور بھائی ہر وقت سکھوں کے خلاف مصروفِ جہاد رہتے تھے۔ ان کی شجاعت آموز آنکھوں میں ہر وقت شہادت کی تمنا جھلکتی نظر آتی تھی۔ اس خاندان کا ہر فرد جانتا تھا کہ پانچ دریاؤں کے آغوش میں نشو و نما پانے والا سکھوں کی شوریدہ سری کا فتنہ مسلمانوں اور اسلام کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ تھا کیونکہ نواب عبد الصمد کے پنجاب میں آنے سے قبل سکھوں نے جو قیامت برپا کر رکھی تھی اور بے بس و مجبور مسلمانوں کے خون کو جس طرح ارزاں کر دیا تھا اس سے سب واقف تھے۔ ان حالات سے حرم میں خاموش زندگی بسر کرنے والی عصمت مآب خواتین تک بھی اچھی طرح باخبر تھیں۔ یہ سب عناصر اور احساسات لازمی طور پر شرف النساء کی تربیت میں شامل رہے ہوں گے۔

اس دور کے تاریخی تذکروں سے یہ بات ثابت ہے کہ شرف النساء کو قرآن کریم سے والہانہ عشق تھا۔ اس مومنہ کی پوری زندگی فقر و استغناء کا ایک ایسا شگفتہ پھول تھی جس کی مہک سے محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی امت کا گلستانِ وجود ہمیشہ بہار بداماں رہے گا اس وقت پنجاب کی کفر و شرک سے معمور فضا میں شرف النساء کی پر سوز اور دل گداز قراءت مسلمانوں کے لئے حیاتِ نو کا ایک پیغام تھی۔ نواب عبد الصمد کے محل میں نغمۂ افلاک بن کر گونجنے والی یہ مقدس آواز اپنے ہر زیر و بم کے ساتھ مسلمانوں کو یہ درس دیتی تھی

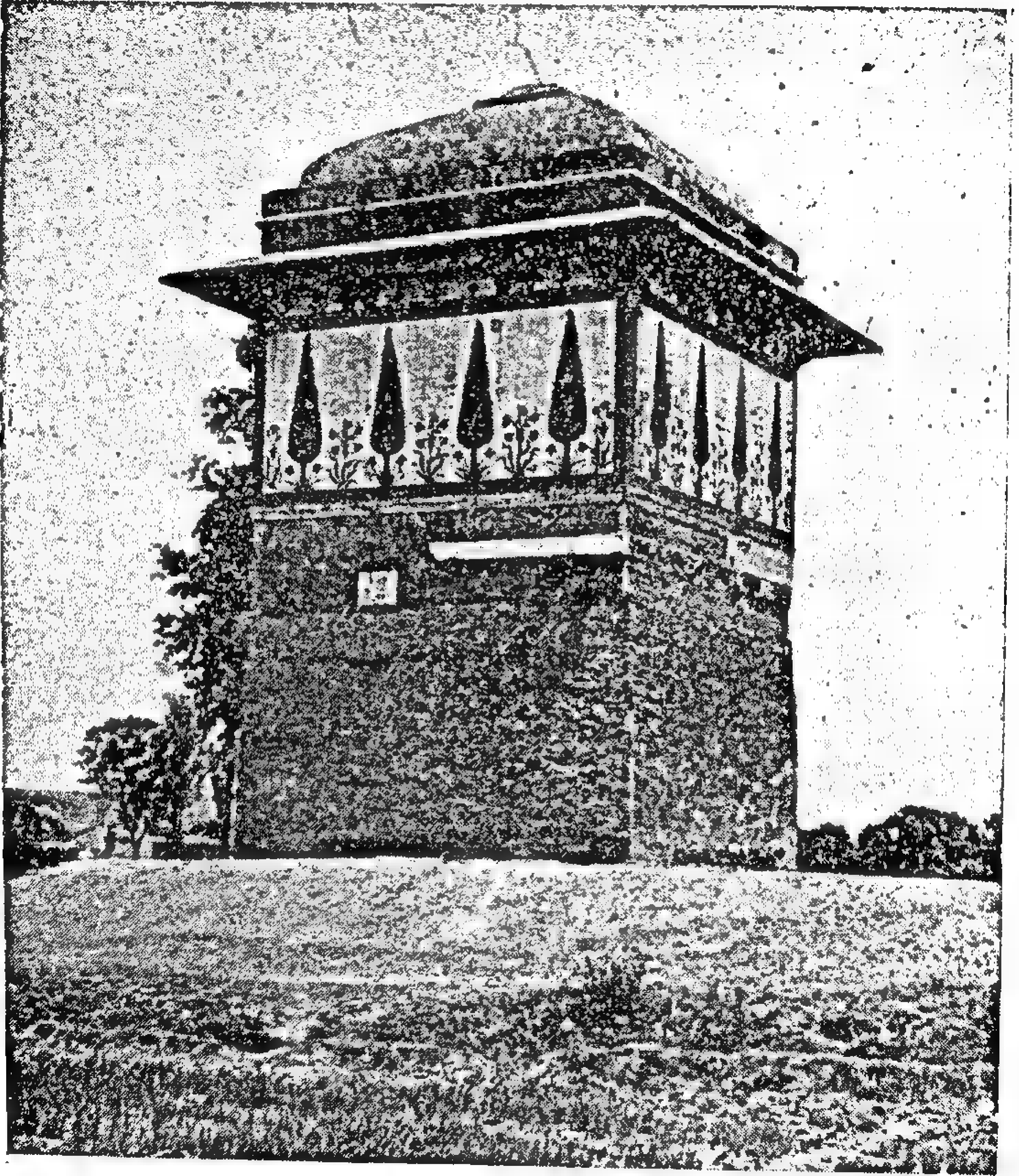
کہ اگر دنیا میں عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہو تو زندگی کے اسلوب اس عظیم کتاب الٰہی میں تلاش کرو جسے تم نے گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا رکھا ہے۔ ورنہ یاد رکھو! پنجاب کے یہ خونخوار سکھ تمہاری بے عملی، خدا فراموشی اور اسلام سے بیوفائی کی عبرت ناک سزا بن جائیں گے۔ اللہ کا قہر تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ دستِ قدرت اپنے آئین کے مطابق تمہارا احتساب کرنے کے لیئے حرکت میں آنے والا ہے۔ اور یاد رکھو! خدا صرف اس لیئے تمہاری مدد نہیں کرے گا کہ تم مسلمان کہلاتے ہو اور مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے کی وجہ سے تمہارے نام مسلمانوں ایسے ہیں کیونکہ وہ صرف ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔

شرف النساء تنہائی اور خلوت میں بڑی رقت اور خضوع کے ساتھ تلاوت قرآن مجید میں منہمک رہا کرتی تھیں۔ اس مقصد کے لیئے انہوں نے ایک خوبصورت چبوترہ محل کے ساتھ ہی تعمیر کرایا تھا جس کے اردگرد خوش نما باغات اور حوض بنوائے گئے۔ چاروں طرف سرو کے خوبصورت درخت لگائے گئے جو مغلوں کے فنِ تعمیر میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ یہ کمرہ پندرہ فٹ آٹھ انچ کی بلندی پر ہے اور اس کا رقبہ تیرہ فٹ دو مربع انچ کے قریب ہے۔ اس چبوترے تک جانے کے لیئے کوئی مستقل سیڑھی نہیں بنائی گئی۔ بلکہ آج تک لکڑی کی سیڑھی استعمال کی جاتی ہے۔ یہی وہ تاریخی عمارت ہے جو شرف النساء کی قدسی آواز سے گونجا کرتی تھی۔ جس کی فضاء میں آج بھی ان کی قرأت کے کیف آفریں قرآنی نغمات محفوظ ہیں۔ اس پاکیزہ عمارت کے درودیوار اگرچہ شاہانہ عظمت و شوکت سے محروم ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے ہر ذرے میں عرفان و حقیقت کے کئی تاج محل پوشیدہ ہیں۔ اس کی ہر اینٹ میں الحمراء کا حسن و جمال پنہاں ہے اور اس کے ہر ریزۂ سنگ میں شمس و قمر کی آب رو جھلک رہی ہے۔ یہی وہ مختصر سا کمرہ ہے، جہاں شرف النساء روزانہ خلوت میں قرآن مجید

کی تلاوت کیا کرتی تھیں۔ بجا! اس جملۂ تقدس پر دیوانہ ہائے خاص و عام اور کروڑوں شیش محل قربان کئے جا سکتے ہیں۔ دو صدیاں قبل اس جگہ سو کے دلکش درختوں کی اوٹ میں عرفان و حقیقت کا ایک ایسا چشمہ بہتا تھا جس کے ترنم سے ملائک وجد میں آجاتے تھے اور آسمان کی رفعتوں سے انوارِ الٰہی سدا بہار پھول بن کر یہاں برستے تھے۔ شاید آپ یہ خیال کریں کہ قرآن مجید سے شرف النساء کا یہ شغف اور بے پناہ ذوق و شوق صرف تلاوت تک محدود تھا اور وہ محض حصولِ ثواب کے لیئے ایسا کرتی تھیں۔ ہرگز نہیں شرف النساء کی زندگی کا جتنا حصہ تاریخ میں محفوظ ہے۔ وہ اس بات کا شاہد ہے کہ قرآن ان کے جذبِ دروں میں آباد ہو چکا تھا۔ ان کی زندگی قرآن کے اسرار و رموز اور حقائق و معارف میں ڈوب چکی تھی۔ قرآن مجید سے شرف النساء کا والہانہ عشق ایک مومنہ اور مجاہدہ کا عشق تھا۔ وہ واقفِ اسرارِ نہاں تھیں۔ ان کی بصیرت قرآن کے ہر لفظ کی گہرائی کو چھونے کی عادی تھی۔ وہ پیکرِ عمل تھیں اور جوشِ کردار کی حسین و جمیل علامت تھیں۔ زندگی بھر ان کا یہ معمول رہا کہ وہ روزانہ اس چبوترے پر قرآن خوانی کے لیئے اس شان سے تشریف لایا کرتی تھیں کہ آنکھوں میں ملائک کی حیا، چال میں حوروں کا تقدس اور چہرے پر ایک باعمل مومن کا جلال و جمال محیط ہوتا تھا۔ ان کے پہلو میں ایک مرصّع اور زرنگار شمشیر لٹکتی رہتی تھی جو ان سے کسی وقت علیحدہ نہ ہوتی۔ کہتے ہیں کہ ہنگامِ تلاوت وہ اس شمشیر کو اپنے سامنے رکھتی تھیں۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اسی طرح خاموش عبادت اور ریاضت میں بسر کردی۔ جب وقتِ آخر قریب آیا تو رحلت سے پہلے اپنی والدہ ماجدہ کو وصیت کی کہ مجھے اسی چبوترے میں دفن کیا جائے۔ میری یہ دونوں چیزیں جو مجھے عمر بھر محبوب رہی ہیں یعنی قرآن اور تلوار میرے ساتھ دفن کی جائیں۔ آپ کی وفات کے بعد وصیت کے مطابق وہی چبوترہ ان کا مدفن بنا

شرف النساء کی خواہش کے مطابق قرآن مجید اور شمشیر قبر کے تعویذ پر رکھ دیئے گئے اور اس چبوترے کے اوپر ایک چھوٹا سا قبہ تعمیر کر دیا گیا۔ اس چبوترے کا دروازہ پختہ اینٹوں کی دیوار سے بند کر دیا گیا تاکہ اندر جانے کے لئے کوئی راستہ نہ رہے۔ خاک لاہور کو یہ شرف حاصل ہے کہ دوسرے کئی صاحب کرامت بزرگوں اور عظمت مآب شہنشاہوں کے علاوہ اس کے سینے میں شرف النساء ایسی بے نظیر، فقید المثال خاتون آرام فرما ہے۔ شرف النساء کا مقبرہ شالیمار کو جاتے ہوئے دائی انگا کے مقبرے کے شمال میں چند قدم کے فاصلے پر آج بھی موجود ہے۔ جس کے چاروں طرف کثرت سے سرو کے درخت ہونے کی وجہ سے سرو والا مقبرہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ عام شاہراہ سے ہٹ کر ایک کونے میں دنیائے اسلام کی ایک ایسی شخصیت محو خواب ہے۔ جس کی مستور عظمت لاثانی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ مختصر اور سادہ، پختہ مقبرہ انیس فٹ طول اور انیس فٹ عرض کے قطعہ زمین پر تعمیر کیا گیا ہے۔ چھجے سمیت اس کی بلندی ساڑھے انتالیس فٹ کے قریب ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ کی تحقیقات کے مطابق یہ مقبرہ دور مغلیہ کی ان تعمیرات کی آخری کڑی ہے جن کے حسین و جمیل نقوش کو سرو کے درخت دوبالا کرتے ہیں۔ اس مقبرے کے انداز تعمیر سے بھی شرف النساء کی عابدانہ اور زاہدانہ زندگی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے وفات کے بعد بھی اپنے تقدس اور حجاب پسندی کو کس طرح پیش نظر رکھا۔ شرف النساء کے بھائی نواب زکریا خان جو تاریخ پنجاب کی ایک معروف شخصیت تھے۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد پنجاب کے وائسرائے مقرر ہوئے اور ۱۷۴۵ء میں فوت ہوئے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے اس مقبرے کے باغات اور چشموں کو وسعت دی ہو۔ سید عبداللطیف نے تاریخ لاہور میں ایک خوب صورت باغ اور حوض کی نشان دہی کی ہے۔ مگر اب اس

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری



مقبرہ شرف النساء بیگم، لاہور

(بشکریہ محکمہ آثار قدیمہ مغربی پاکستان)

میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ افسوس ہے کہ شرف النساء کی تاریخ پیدائش اور وفات سے متعلق کوئی قابلِ اعتماد روایت نہیں ملتی۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۴۰ء تک ✓ قرآن کریم اور مرصّع شمشیر بدستور شرف النساء کی قبر کی تعویذ پر موجود رہے۔ مگر جب سکھ باہمی خانہ جنگی کا شکار ہوئے اور پنجاب میں ہر طرف طوائف الملوکی پھیل گئی تو ایک لالچی سکھ نے اس خیال سے شرف النساء کے مقبرے کا دروازہ منہدم کر دیا کہ شاید اس میں مال و دولت بند ہو۔ وہاں اس درندہ صفت انسان کو اور تو کچھ نہ ملا، وہ اس مخدرۂ عصمت کی تاریخی تلوار اور قرآن چوری کر کے لے گیا۔ افسوس ہے کہ اس عظیم خاتون نے اپنی جن دو محبوب چیزوں کو مرنے کے بعد بھی جدا کرنا گوارا نہ کیا، وقت کے بے رحم ہاتھوں نے انہیں لوٹ لیا اور آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ شرف النساء کی یہ تاریخی امانت کہاں گئی۔

اس عالی مرتبت اور اسلام کی عاشق خاتون کے حالات پر صدیوں تک پردہ پڑا رہا۔ مؤرخین نے نواب عبدالصمد اور زکریا خاں کے حالات میں ان کا سرسری سا ذکر کرنے پر اکتفا کیا۔ جس کی وجوہ پر ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ عرصہ دراز کے بعد حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم نے پہلی مرتبہ جاوید نامہ میں ان کی عظمت و بلند کرداری سے پردہ سرکایا تو لوگ شرف النساء کے نام سے قدرے واقف ہوئے۔ علامہ مرحوم نے جس عقیدت اور ارادت کے ساتھ اس عارفۂ ملت کا ذکر کیا ہے اس سے شرف النساء کے مرتبہ کا اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ کسی ماں نے اس عظمتِ کردار کی مالک بیٹی جنی ہی نہیں اور ہماری ملت کے بحرِ پایاب میں آج تک کوئی ایسا موتی پیدا نہیں ہوا۔

شرف النساء کی زندگی ہماری قوم کے لیئے پیغامِ عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اگر ان کے زندگی بھر کے معمول پر غور کیا جائے تو شرف النساء ہمیں ایک بہت بڑی

سا حقیقت سے روشناس کراتی ہیں۔ اُن کی زندگی کی تفسیر ہے کہ قرآن مومن کا جمال اور تلوار اس کا جلال ہے۔ ایک سچے مسلمان کی زندگی اُن ہی دو عناصر سے بنتی ہے شرف النساء ہمیں بتاتی ہیں کہ قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں انسان کی انفرادی زندگی کے معمولی مسائل سے لے کر اجتماعی زندگی کے بڑے بڑے پیچیدہ معاملات تک کے لئے ہدایت موجود ہے۔ ایک اسلامی سوسائٹی میں گدائے بے نوا کی تیرہ و تار جھونپڑی سے لے کر دربار شاہی تک اور بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اور پیدائش سے لے کر موت تک مسلمان کا ہر فعل اور ہر کام قرآن کی حدود کے اندر رہنا چاہیئے۔ قرآن ایک غیر متبدل اور اٹل آئینِ فطرت ہے جو ہمیں ایک مسلمان کی طرح زندہ رہنے کے اسلوب سکھاتا ہے۔ قرآن مسلمانوں کی عظمت اور سلطنت ہے اور تلوار اس کی محافظ ہے۔ اس حقیقت سے آج بھی کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ کسی ملک کا آئینِ حکومت کیسا ہی بے نظیر اور مکمل کیوں نہ ہو۔ اگر اس کی حفاظت کے لئے اس ملک کے پاس فوج نہ ہو۔ اور اس قوم کے افراد میں دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ ہو، تو وہ چند سال بعد ہی اپنے آئین سمیت تاریخ کے اوراق میں دفن ہو جائے گا کیونکہ دشمن قوتیں اسے کبھی زندہ نہ رہنے دیں گی۔ شرف النساء کی زندگی بھی اسی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ وہ عرفانِ حقیقت تک پہنچنے کے بعد ہمیں یہ درس دیتی ہیں کہ اسلام قرآن کی صورت میں دنیائے انسانیت کے لئے ایک رحمت بن کر آیا ہے۔ یہ انسان کی حقیقی آزادی اور عظمت کا علمبردار ہے اور اس کی تعلیم پر عمل پیرا ہو کر ہم ضمیرِ کائنات کو بدل سکتے ہیں۔ ہم دنیا کو حقیقی مساوات، محبت و اخوت، ایثار و قربانی، شفقت و محبت، ہمدردی و غمگساری، آزادی و حریت، حق و صداقت اور عدل و انصاف کی جنت بنا سکتے ہیں۔ قرآن پاک کے پیدا کردہ ان اعلیٰ اوصاف سے متصف ہو کر ہی ہم خلافتِ ارضی کے حق دار بن سکتے ہیں۔ یہ اوصاف ایک ایسی

طاقت ہیں جو دنیائے قلب و نظر میں انقلاب برپا کر دیتی ہے اور کائناتِ ہستی کی ہر عظمت اور ہر بلندی مومن کے قدموں پر سجدہ ریز ہو جاتی ہے لیکن دنیا کبھی بدی کی شیطانی قوت سے خالی نہیں رہتی۔ اور یہ طاقت ہر وقت نیکی کو فنا کر دینے کے لئے کمربستہ رہتی ہے۔ اس لئے مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ بدی کی ہر بڑی سے بڑی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہے۔ اس کے بغیر ظلم و تشدد اور جبر و استبداد کو سرنگوں کرنا ممکن نہیں۔ انسان اس عالم کون و مکان میں صرف نیکی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے لئے نیکی کی حفاظت بھی ناگزیر ہوتی ہے۔ شرف النساء کی زندگی اس مسلک کی طرف عملی اشارہ ہے کہ قرآن اگر بلند ترین اور اکمل ترین زندگی کا نام ہے تو تلوار اس کی حفاظت کا ایک ذریعہ ہے اور یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی محافظ ہیں۔ اسی طرح اگر مسلمان کی زندگی سے قرآن خارج ہو جائے تو ایک وحشی، درندہ اور ظالم باقی رہ جاتا ہے۔ صرف طاقت جہالت اور جور و استبداد کا نام ہے۔ اگر تلوار کی قوت ہر قید و بند سے آزاد ہو تو وہ صرف ہلاکو اور چنگیز پیدا کرتی ہے۔ ظلم و جور اور سفاکی اس کا قانون ہوتا ہے۔ لیکن اگر تلوار کی قوت قرآن کے زیرِ سایہ رہے تو تاریخ کا دامن حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی المرتضیٰؓ۔ حضرت خالد بن ولیدؓ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم اور عالمگیرؒ ایسے حکمرانوں اور فاتحین سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ شرف النساء کی بصیرت نے اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ صرف تلوار، ہلاکت اور چنگیزی کا نام ہے۔ قہر و تشدد اور ظلم و عدوان کی علامت ہے اور صرف قرآن کی سطحی پابندی کمزوری ہے جو بدی کی طاقتوں کو پائمال کر دینے کی دعوت دیتی ہے۔ مسلمان خیر و شر کی اس دنیا میں اسی صورت زندہ رہ سکتا ہے کہ اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہو

قرآن سے وہ انسانی دنیا کو رشکِ فردوس بنا تا جائے، اسے گہوارہ امن وامان میں بدلتا رہے اور تلوار سے اس کی حفاظت کا کام لیتا رہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ تلوار کی طاقت سے دوسروں کو مطیع و فرمانبردار بناؤ۔ اور قرآن سے جبراً ان کے عقائد و مذاہب تبدیل کرو۔ اس قسم کی غلط فہمیاں متعصب اور تنگ نظر مؤرخوں نے پیدا کی ہیں۔ اس مسلک کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کے اعجاز اور اس کی اخلاقی طاقت سے دلوں کو مسخر کرو، خود دوسروں کے لیئے نمونہ بنو اور ان کے قلب و ذہن کو اللہ کے نور سے اس طرح روشن کرو کہ وہ انسانوں کے سامنے جھکنا چھوڑ دیں۔ صرف اپنے خالق کے مطیع و فرماں بردار بن کر زندہ رہنا سیکھ جائیں۔ پھر تلوار سے ان کی حفاظت کرو۔ ایسا نہ ہو کہ بدی کی طاقت ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی قوم نے اپنے بلند اصولوں کو چھوڑ دیا اور اپنے مذہب کو عیش و عشرت، بدکرداری اور بے عملی کا جواز بنالیا تو وہ دونوں طاقتوں سے محروم ہو کر صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ خود مسلمانوں کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے جب بھی صرف تلوار پر بھروسہ کیا اور قرآن کی تعلیم کو فراموش کر دیا تو ہم ظلم و ستم کی انتہا تک جا پہنچے اور یہی انتہا ہمارے زوال کا باعث بنی۔ اس کے برعکس جب کبھی ہم نے قرآن کی تعلیم کو لغوی بکھیڑوں میں الجھا دیا، اپنی ساری قوت جامد و ساکت تصوف اور بے روح عبادات پر صرف کرنا شروع کر دی۔ اور تلوار کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا تو بدی کی کوئی نہ کوئی طاقت قہرِ الٰہی بن کر نازل ہو گئی۔ ہم نہ صرف تباہ و برباد ہوئے بلکہ صدیوں تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہے اور ذلت و نکبت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے۔ ایسا کیوں ہوا۔ صرف اس لیئے کہ ہم بھول گئے کہ قرآن اور تلوار دو قوتیں ایک دوسرے کی محافظ ہیں۔ اگر ہم خلوصِ نیت کے ساتھ قرآن پر عمل پیرا

رہیں تو خود قرآن کی ہر آیت ہمیں اس حقیقت سے آشنا کر دیتی ہے کہ مومن دنیا میں کمزور اور بے بس بن کر کبھی زندہ نہیں رہتا۔ وہ کبھی گوارا نہیں کرتا کہ دوسروں کے لئے ترنوالا بن جائے اور دشمن جب چاہیں اسے نیست و نابود کر دیں۔ قرآن جس دینِ قیم کی تعلیم دیتا ہے اس کی حفاظت بھی ہر مومن پر واجب قرار دیتا ہے اسی کو قرآن کے الفاظ میں جہاد کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا پابندِ فرمان مومن کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ کبھی تلوار کی طاقت سے محروم ہو جائے۔ کافر اور مومن میں یہی فرق ہوتا ہے کہ کافر کی تلوار ہر قید و بند سے آزاد ہوتی ہے۔ مگر مومن کی تلوار ہمیشہ قرآن کے تابعِ فرمان رہتی ہے۔ کافر ہمیشہ اسے اپنے ذاتی مقاصد اور اپنی اغراض کے لئے بلا امتیاز انسانی خون سے غسل دیتا ہے مگر مومن صرف اللہ کے لئے تلوار بے نیام کرتا ہے جہاں اس کی ذات بیچ میں آ جائے وہ پچھاڑے ہوئے دشمن کو بھی چھوڑ دیتا ہے۔

شرف النساء ایک باعمل مومنہ تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کو اسی حقیقت کا آئینہ دار بنا رکھا تھا وہ تاریخ اسلام کی پہلی اور آخری خاتون ہیں جن کی سیرت میں جہاں سادگی، عبادت، ریاضت اور تقوےٰ کا پہلو نمایاں ہے۔ وہاں بے پناہ فلسفیانہ گہرائی بھی نظر آتی ہے جس کا درس دینے کے لئے انہوں نے اپنی پوری زندگی کو اسی سانچے میں ڈھال کر ایک زندۂ جاوید مثال ہمارے سامنے رکھ دی اور خاموش زبان میں کہا اے مسلمان مردو! دنیا میں عظمت و وقار کے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو اپنی دنیا کو قرآن اور تلوار کی رفاقت سے آباد رکھو۔ اگر تم نے ان دونوں کو فراموش کر دیا تو خدا تم کو فراموش کر دے گا اور تم ذلیل و خوار کئے جاؤ گے —— تاریخ سے پوچھئے۔ کیا شرف النساء کی موت کے تھوڑا عرصہ بعد ایسا نہیں ہوا؟ سکھوں نے مسلمانوں کی عظمت و شوکت کو نہیں لوٹا۔ ان کے خون سے ہولی نہیں کھیلی اور انہیں

ذلیل و خوار نہیں کیا۔

ہماری مسلمان بہنوں کو شرف النساء کے اس نور بصیرت پر فخر کرنا چاہیے جس پر ہزاروں فلسفی، لاکھوں علماء اور فضلاء قربان کیے جا سکتے ہیں۔

غور کیجیے کہ شرف النساء کا نام اور ان کی سیرت مفہوم و معانی کے لحاظ سے کس طرح ہم آہنگ ہے۔

باب چہارم

حضرت محل

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جس کی بہادری اور جرأت نے گلستانِ لکھنؤ کے نرم و نازک پھولوں کو آگ کی چنگاریوں میں تبدیل کر دیا۔ جس کی حریت نوازی نے شامِ اودھ کے حسن و جمال کو شعلوں کا پیرہن عطا کر کے ثابت کر دیا کہ ایک محب الوطن اور بہادر عورت عیش و عشرت، نزاکت و لطافت، اور تکلفات کی فضا میں سانس لینے والے رنگیلے مردوں کو توپوں کے آتشیں گولوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کے قابل بھی بنا سکتی ہے۔

حضرت محل

حضرت محل کا نام امراؤ تھا۔ غدر سے نو سال پہلے دسمبر ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ کے مشہور عیش پرست نواب واجد علی شاہ نے امراؤ کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ اور اپنی اس نئی ملکہ کو حضرت محل کا خطاب عطا کیا۔ شادی سے قبل امراؤ شاہی محل میں رقص و سرود کی تعلیم حاصل کرتی تھی۔ مگر جلد ہی اس سانولی لڑکی کی پرکشش شخصیت نے نواب واجد علی شاہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ شادی سے پہلے بھی امراؤ کی زندگی محل کی چار دیواری تک محدود تھی مگر شادی کے بعد وہ ملکہ اودھ کی حیثیت سے شاہی رسوم و آداب کی اور زیادہ پابند بنا دی گئی۔ اس طرح وہ بیرونی دنیا سے بالکل بے تعلق زندگی بسر کرتی تھی اور اسے حرم سے باہر کے حالات سے کوئی علاقہ نہ ہوتا تھا۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اودھ کے اس رنگیلے اور عیش پرست نواب کو تخت و تاج سے معزول کر کے اس کی قلمرو کو سلطنت برطانیہ میں شامل کر لیا۔ نواب واجد علی شاہ ایسے راجہ اندر کے لئے یہ ناقابل برداشت صدمہ تھا کہ انگریزوں نے بیک جنبش قلم اس کی آباد کی ہوئی بزم عیش و طرب کو قبرستان کی ویرانی میں تبدیل کر دیا۔ اور آنکھ جھپکتے ہی وہ بادشاہ سے ایک بے بس مجبور کاغذی نواب بن کر رہ گیا۔ جس کے تمام اختیارات سلب ہو چکے تھے۔ نواب واجد علی شاہ اپنے حاشیہ نشینوں اور مشیروں سے مشورہ کے بعد اپنا مقدمہ لڑنے کے لئے کلکتہ چلے گئے اور اپنی بیوی حضرت محل اور کمسن لڑکے برجیس قدر کو لکھنؤ چھوڑ گئے۔ واجد علی شاہ ابھی کلکتہ میں ہی مقیم تھے کہ غیر منقسم ہندوستان کے طول و عرض میں انگریزوں کے خلاف

بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اسی بغاوت سے برصغیر کی جنگ آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔ ۱۸۵۷ء میں اکثر والیانِ ریاست نے بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جس میں انگریزوں کی بھرتی کی ہوئی مقامی فوج بھی شامل ہو گئی۔ اس جنگ کا آغاز میرٹھ کی فوجی چھاؤنیوں سے ہوا اور جنگل کی آگ کی طرح یہ بغاوت ہندوستان کے اکثر صوبوں میں پھیل گئی۔ اودھ کا دار السلطنت لکھنؤ اس وقت نواب واجد علی شاہ کی غیر حاضری کی وجہ سے خالی پڑا ہوا تھا کیونکہ انگریزوں نے صورت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے انہیں فوراً ہی نظر بند کر دیا تھا۔ دربارِ لکھنؤ کے با اثر امراء پہلے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے شدید مخالف تھے۔ چنانچہ ملکی سیاسیات کا نقشہ اس تیزی سے بدلتے دیکھ کر وہ نواب واجد علی شاہ کی دو بڑی بیگمات کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ بیٹوں میں سے کسی ایک کو تخت پر بٹھانے کی اجازت دیں تاکہ انگریزوں کے خلاف جنگ کا آغاز کیا جا سکے مگر ان دونوں نے صاف انکار کر دیا۔ آخر نواب شمشیر الدولہ بہادر کے مشورے سے واجد علی شاہ کے کمسن بیٹے برجیس قدر کو تخت نشین کرنے کا فیصلہ ہوا اور نواب حضرت محل کو اس کی سرپرست اور مختار کل تسلیم کر لیا گیا۔ حضرت محل پردہ میں رہنے کے باوجود بے حد دلیر، باہمت اور جرات مند خاتون تھیں۔ انہوں نے غیر معمولی شجاعت کا ثبوت دیتے ہوئے اس فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کر دی چنانچہ ۵ رجولائی ۱۸۵۷ء کو چھ بجے شام قیصر باغ لکھنؤ میں مرزا برجیس قدر کی تاج پوشی ہوئی۔ نواب واجد علی شاہ کے تمام ممتاز امراء بڑے بڑے عہدوں پر فائز کر دیئے گئے اور حضرت محل نے نائب السلطنت کی حیثیت سے یہ خطرناک کام اپنے ذمے لے کر زندگی کی بازی لگا دی۔ انہوں نے سب سے پہلے اودھ کے تعلقہ داروں کے نام ایک حکم جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ملک آبائی خدا نے اب ہمیں عطا کیا ہے۔ انگریز کافروں کو اس ملک سے ختم کرنا سب کا فرض ہے اس لئے اکٹھے

ہو کر سپاہی گارد کی باقی فوج کو قتل کر دیا جائے جو اس لڑائی میں حصہ لے گا اس کا نصف علاقہ اسے معاف کر دیا جائے گا۔ یہ فرمان جاری ہوتے ہی لوگوں نے انگریز سپاہیوں اور افسروں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا اور صرف گیارہ دن کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ اودھ کے کسی ضلع میں انگریزی حکومت کا کوئی حاکم موجود نہ تھا اور انگریزوں کی حکومت بھولا بسرا خواب معلوم ہوتی تھی۔ تقریباً تمام اضلاع ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے سے نکل چکے تھے اور اکثر تعلقہ داروں نے دیہات پر قبضہ کر لیا تھا۔

اودھ کے طول و عرض میں اب حضرت محل کی حکومت تھی اور انہیں قدر کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ حضرت محل نے حیرت انگیز دانش مندی سے کام لیتے ہوئے ایسے پرخطر حالات میں سلطنت کے بڑے بڑے عہدے دار مقرر کیے، ٹیکس کی وصولی کا معقول انتظام کیا اور اپنی انقلابی فوج کو نہایت اچھے پیمانے پر منظم کیا۔ اگرچہ انگریزی عہد کے لکھے ہوئے تذکروں میں حضرت محل کو ایک بے وقوف، جلد باز اور عاقبت نا اندیش عورت کے روپ میں پیش کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت محل کی جرأت، بہادری، وطن پرستی، مستعدی اور نیک نفسی ان دنوں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک ایسی پردہ نشین عورت جس نے عمر بھر بلا ضرورت باہر قدم نہ نکالا تھا اور ان ہنگاموں سے الگ تھلگ زندگی بسر کی تھی اچانک اس کے کندھوں پر اس قدر بھاری اور اہم ذمہ داریاں ڈال دی گئیں۔ کہ پوری مملکت اودھ اس کی قیادت میں ایک بہت بڑی غیر ملکی قوت سے نبرد آزما ہو گئی۔ مشہور ہے کہ حضرت محل پردے میں بیٹھ کر دربار کرتی تھیں اور شاہی فرمان جاری کرتی تھیں بلکہ جنگ کے ایام میں وہ اکثر خود گھوڑے پر سوار ہو کر فوج کے ہر دستے کے پاس جا کر سپاہیوں کی ہمت بندھاتی تھیں۔ اس عرصے میں انہیں شاید ہی کسی دن چند گھنٹے سونے کی مہلت نصیب ہوتی ہو ورنہ پوری مملکت کے نظم و نسق کو سنبھالنا اور فوجوں کی قیادت کرنا

ایک ناتجربہ کار عورت کے لیئے ناممکن تھا۔ ان ہی دنوں ایک اور مجاہد بزرگ مولوی احمد اللہ شاہ اپنے جان نثاروں سمیت لکھنؤ آگئے اور انہوں نے انگریزوں کے خلاف علیحدہ محاذ قائم کر لیا۔ ملکہ حضرت محل بڑی دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے بربیں قدر کے ساتھ خود ان کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انہیں اپنا سرپرست بنا لیا۔ اس طرح شاہ صاحب ان کے مشیر خاص بن گئے۔ حضرت محل نے یہ قدم محض اس لیئے اٹھایا تھا کہ جنگ آزادی کی تحریک دو حصوں میں بٹ کر کمزور نہ ہو جائے مگر بعض با اثر امراء کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ انہوں نے اپنی چودھراہٹ خطرے میں دیکھ کر حضرت محل کے خلاف سازشوں کے جال بچھانا شروع کر دیئے اور آخر اس تحریک کے گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگ گئی۔ ۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء کو مولوی احمد اللہ شاہ کی قیادت میں انگریزوں کی فوج پر حملہ ہوا۔ انگریز تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے قلعہ بند ہو کر لڑ رہے تھے۔ حضرت محل نے فوج میں اعلان کیا کہ ان کے حکم کے مطابق جنگ جاری رکھو، تنخواہ وہی ادا کریں گی۔ یہ اعلان اس لیئے کرنا پڑا کہ بعض غداروں نے فوج میں بددلی پھیلانا شروع کر دی تھی۔ حملے کے دن حضرت محل ساری رات محاذ پر انتظام میں مصروف رہیں۔ اور ایک لمحہ کے لیئے آرام نہ کیا۔ اگرچہ حضرت محل کے دیوانِ خاص کے داروغہ میر واجد علی خاں عرف ممو خاں نے موقع پر غداری کی مگر حضرت محل کی فوج نے یہ مورچہ فتح کر لیا۔ عالم باغ کی لڑائی میں راجہ مان سنگھ نے انگریزوں کو شکست فاش دی تو حضرت محل نے اسے ایک گراں قیمت رومال اور دو شالہ بطور خلعت عطا کیا۔ اس وقت اسی ہزار کے قریب سپاہی حضرت محل کے جھنڈے تلے لڑ رہے تھے کہ کمپنی کے فوجی افسروں نے خفیہ طور پر سازشی لوگوں کی حوصلہ افزائی شروع کر دی۔ چنانچہ حضرت محل کا ایک افسر مہاراجہ بال کرشن انگریزوں سے جا ملا اور اس نے ملکہ کو غلط مشورے دیکر محاذِ جنگ کو بے حد کمزور کر دیا۔ ادھر ممو خاں مولوی احمد اللہ شاہ کے خلاف سازشوں

میں مصروف تھا۔ اس حالت میں ایک گورکھا رجمنٹ نے عالم باغ پر حملہ کر دیا اور حضرت محل کی کوٹھی کو گھیر لیا۔ مگر مولوی احمد اللہ شاہ نے اس حملے کو آگے بڑھ کر خود سنبھالا تاکہ حضرت محل کو نکل جانے کا موقع مل جائے۔ حضرت محل وہاں سے نکل کر محل سرائے حسین آباد آگئیں۔ شام کو علی رضا کے ذریعے انگریز جرنیل کا پیغام ملا کہ کمپنی حکومت واجد علی شاہ کا علاقہ بحال کر دے گی اور اس کی بادشاہی آپ کے سپرد کر دی جائے گی مگر شرط یہ ہے کہ جنگ بند کر دیں اور فوج کا ساتھ چھوڑ دیں۔ حضرت محل نے یہ پیشکش انتہائی حقارت سے ٹھکرا دی اور صلح نامے پر دستخط سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد حضرت محل اپنے چھ ہزار مسلح جانثاروں کے ساتھ شاہجہان پہنچ کر دوبارہ جنگ میں شریک ہو گئیں۔ وہاں سید احمد اللہ شاہ انگریزوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ساتھیوں کی غداری کی وجہ سے شاہ صاحب کو شکست ہوئی تو حضرت محل اپنے بیٹے برجیس قدر کے ساتھ دریائے گھاگرا عبور کر کے نیپال کی طرف چلی گئیں۔ طرح طرح کے مصائب برداشت کئے اور اس پرخطر سفر میں ناقابل بیان تکالیف اٹھائیں مگر انگریزوں کے سامنے ذلت و عجز کے ساتھ سر نہیں جھکایا۔ نیپال کے راجہ نے اگرچہ حضرت محل اور شہزادہ برجیس قدر سے اچھا برتاؤ کیا مگر ان کے باقی تمام ساتھیوں کو گرفتار کرا دیا یا ملک سے باہر نکلوا دیا۔ حضرت محل نے اپنی زندگی کا باقی حصہ بڑی تنگدستی اور عسرت میں نیپال کے پہاڑی علاقے میں بسر کیا۔ کچھ عرصہ بعد جب حالات اعتدال پر آئے انگریزوں کے ظلم و تشدد کا دور ختم ہوا اور عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔ تو انگریزوں نے حضرت محل اور برجیس قدر کو واپس بلانے کی بہت کوشش کی اور یہاں تک پیشکش کی کہ اگر وہ لکھنؤ واپس آجائیں تو ان کے شاہانہ احترام کا لحاظ رکھا جائے گا۔ معقول وظیفہ بھی دیا جائے گا اور وہ جہاں پسند کریں انہیں رہنے کی اجازت ہوگی۔ مگر اس غیرت مند اور حریت پرست خاتون نے اس غلام آباد میں واپس آنا منظور نہ کیا اور انگریزوں کی گدائی قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

وہ نیپال میں فوت ہوئیں اور وہیں انہیں دفن کیا گیا۔

حضرت محل کی زندگی خودداری، غیرت مندی، بہادری، عزم و استقلال اور شجاعت کی ایک ایسی تصویر ہے جس کے نقوش کو وقت کا ہاتھ کبھی نہ مٹا سکے گا۔ بلکہ گزرنے والا ہر لمحہ ان نقوش کو اور زیادہ اجاگر کرتا جائے گا۔ حضرت محل اگر چاہتیں تو ان مایوس کن حالات میں انگریز جرنیل کی پیشکش قبول کر کے اپنی اور اپنے بیٹے کی زندگی بچا سکتی تھیں۔ بلکہ حکومت بھی حاصل کر سکتی تھیں۔ مگر ان کی شجاعت اور غیرت نے اپنے جان نثاروں اور تحریک آزادی کے علمبرداروں کو دغا دینا پسند نہ کی۔ اور انتہائی حقارت کے ساتھ اس سودے بازی کو ٹھکرا دیا۔ وہ جبکہ غریب الوطنی کے ایام میں عسرت و ناداری کی زندگی بسر کر رہی تھیں اس وقت بھی ان کی خودداری نے کاسہ بدست ہو کر انگریزی دربار میں مرحمت خسروانہ کے لئے جانا گوارا نہ کیا بلکہ وطن سے دور ایک اجنبی دیس میں مفلسی کی موت کو ترجیح دی۔ لوگ کہتے ہیں کہ پردے میں رہ کر عورت کے جوہر نہیں کھلتے مگر حضرت محل کی زندگی اس کی مجسم تردید ہے۔ کیا ہمارے جدید عشرتکدوں نے ایک حضرت محل بھی پیدا کی ہے جو یوں مردانہ وار آگ کے شعلوں سے کھیل کر قوم کی قیادت کر سکے جب کہ موت سامنے کھڑی مسکرا رہی ہو۔

خالدہ ادیب خانم

ایک شعلہ بیان مقررہ، ایک صاحب طرز ادیبہ
ایک بالغ نظر مدبرہ۔ ایک مجاہدہ جس نے ترک قوم
کے ولولوں کو زندگی بخشی۔ جس کے زورِ بیان نے
ان کی امنگوں کو ابھارا، جس کی تحریروں نے مردِ بیمار
یورپ کی مسیحائی کی، جس کے مجاہدانہ عمل نے ترکوں
کو ایک نئی روایت سے آشنا کیا۔ ایک محب الوطن
خاتون جو تلوار سے قلم کا اور قلم سے تلوار کا کام لینا
جانتی تھی۔ جس کی آتش نوائی تلوار اور قلم دونوں کو زندگی
بخشتی رہی۔

خالدہ ادیب خانم

خالدہ خانم نام تھا۔ ان کے والد عثمان ادیب پاشا سلطان عبدالحمید کے وزیر خزانہ تھے۔ خالدہ نے اپنی دوسری دو روشن خیال بہنوں نگار خانم اور نفیس خانم کے ساتھ قسطنطنیہ کے رابرٹس کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئیں۔ پانچ سال کی عمر میں تعلیم شروع کی اور ۱۹۰۱ء میں امتیاز کے ساتھ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ریاضیات کے ایک استاد پروفیسر احمد صالح سے شادی ہوئی جس سے دو تین بچے ہوئے۔ جب احمد صالح نے دوسری شادی کر لی تو خالدہ نے طلاق حاصل کر کے فوج کے ایک ڈاکٹر عادل بے سے شادی کر لی۔ ان کے دوسرے شوہر جلد ہی انتقال کر گئے۔

خالدہ نے چونکہ ایک علم دوست گھرانے میں پرورش پائی تھی اس لئے بچپن سے ہی انشاپردازی اور لکھنے پڑھنے کا بہت زیادہ شوق تھا انہوں نے طالب علمی کے زمانے ہی سے افسانہ نگاری شروع کر دی اور جلد ہی ان کا شمار ترکی کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہونے لگا۔ کچھ عرصہ بعد ان کے افسانے یورپ کے اکثر ممالک میں بہت زیادہ مقبول ہوئے۔ علمی اور ادبی مصروفیات کے باوجود وہ ہمیشہ قومی اصلاح و ترقی کے کاموں میں منہمک رہتی تھیں۔ انہوں نے ترک عورتوں کے حقوق کے لئے بے پناہ جدوجہد کی اور خواتین کی حالت بہتر بنانے کے لئے کئی چھوٹی چھوٹی انجمنیں قائم کیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اخبارات و رسائل میں بے شمار مضامین لکھے اور ترک قوم کے ہر حلقے میں باعزت جگہ پیدا کر لی۔

جب پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو ترکوں کی حالت نہایت ابتر ہو چکی تھی اور وہ ایک گرتی ہوئی دیوار خیال کئے جاتے تھے۔ سلطان عبدالحمید اور وزیر اعظم فرید پاشا یورپی اتحادیوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح کھیل رہے تھے۔ ترکوں ایسی بہادر اور شجاع قوم کی دیرینہ روایات خاک میں ملتی جارہی تھیں۔ ہر طرف بدنظمی بے اطمینانی اور تباہی کا دور دورہ تھا۔ ملکی معیشت ڈانواں ڈول تھی۔ عسکری حالت جنگ کے بعد ویسے ہی ناگفتہ بہ ہو چکی تھی اور ترکی حکومت کا وقار عملاً ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ تمام مقبوضات ہاتھ سے نکلتے جارہے تھے۔

۱۹۱۸ء میں صورت حال اور زیادہ خراب اور تشویشناک ہوگئی۔ فرانس، برطانیہ، اٹلی اور امریکہ کے جنگی جہاز درۂ دانیال میں داخل ہوگئے جس سے ملک کی سالمیت اور آزادی خطرے میں پڑگئی۔ دشمن فوجوں نے پیش قدمی کر کے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور قریب تھا کہ دنیائے اسلام کی یہ عظیم الشان سلطنت ہمیشہ کے لئے مٹ جاتی کہ ایک نوجوان ترک فوجی افسر مصطفےٰ کمال پاشا نے ایک طرف دشمن اتحادیوں کو دوسری طرف ملک کی کٹھ پتلی حکومت کو مجاہدانہ عزم کے ساتھ للکارا۔ اس دوران اتحادیوں نے ترکوں پر بے پناہ مظالم کئے خصوصاً سمرنا میں یونانیوں نے مسلمانوں پر اس قدر ظلم و تشدد کیا کہ سارا عالم اسلام تڑپ اٹھا۔ مصطفےٰ کمال نے ترکی کے نوجوان قوم پرستوں کو جمع کر کے منظم کیا اور بڑے نظم و ضبط اور تدبر کے ساتھ دشمن کی فوجوں کا مقابلہ شروع کر دیا۔ ان حالات میں خالدہ خانم ایسی غیور اور محب الوطن خاتون کیسے چین سے بیٹھ سکتی تھی۔ اپنے ملک کو یوں تباہ و برباد ہوتے دیکھ کر وہ تڑپ اٹھی۔ جب قسطنطنیہ میں قوم پرستوں کو تختۂ مشق بنایا گیا تو خالدہ نے شاہی حقوق کی حفاظت اور ملک کی آزادی کے لئے فقید المثال پرجوش تقریریں کیں۔ ان کی بے مثل خطابت سے ملک کے درودیوار گونج اٹھے۔ لوگ لاکھوں کی تعداد میں ان کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اور انتہائی احترام و عقیدت

کے ساتھ ان کی تقریریں سنتے تھے خالدہ خانم کی آتش نوائی اور شعلہ بیانی نے اتحادیوں کے لیئے نہایت مشکل حالات پیدا کر دیئے۔ ترکی کی تمام عورتیں خالدہ خانم کے اشارہ ابرو پر کٹ مرنے کے لیئے تیار تھیں۔ یہ صورت دیکھ کر ترکی کے وزیر اعظم فرید پاشا نے ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے۔ خالدہ خانم خوب سمجھتی تھیں کہ اس مشکل اور نازک دور میں ان کی قوم کو بے لوث اور پرجوش کارکنوں کی سخت ضرورت ہے اس طرح قید ہو جانے سے ان کا کام ادھورا رہ جاتا اور وہ اپنی قوم کی کسی خدمت کے قابل نہ رہتیں۔ حکومت اور اتحادی بھی یہی چاہتے تھے۔ جب خالدہ خانم کو اپنی گرفتاری کے احکام کا علم ہوا تو وہ ڈاکٹر عدنان بے کے ساتھ انقرہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ انہوں نے رات کی تاریکی میں آبنائے باسفورس کو عبور کیا جہاں ہر قدم پر دشمنوں کے جنگی جہاز موجود تھے۔ یہ خطرناک سفر طے کرنے کے بعد وہ دونوں خچر پر سوار ہو کر اناطولیا کے جنگلوں سے گزر کر انقرہ پہنچ گئے۔ انقرہ میں مصطفٰے کمال پاشا سے ان کی ملاقات ہوئی وہ خالدہ خانم کی صلاحیتوں اور ان کی عظیم شخصیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں خالدہ کو انقلابی حکومت میں ممتاز مقام حاصل ہو گیا۔ مصطفٰے کمال نے انہیں آزاد ترکی کی پہلی پارلیمنٹ کا رکن نامزد کیا اور اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں جب نئی حکومت مرتب ہوئی تو ترکی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک عورت وزیر تعلیم کے عہدہ پر فائز ہوئی۔ یہ خاتون خالدہ ادیب خانم تھیں۔ خالدہ ۱۹۱۷ء میں ہی ایک بہادر اور قوم پرست راہنما ڈاکٹر عدنان بے سے شادی کر چکی تھیں۔ انقرہ پہنچ کر وہ چیف جج مقرر ہوئے پھر انہیں قسطنطنیہ میں گورنر جنرل مقرر کر دیا گیا۔ اس دوران خالدہ خانم انقلابی حکومت کی دستِ راست بن کر ملک کی خدمت میں مصروف رہیں انہوں نے اہم سیاسی آئین اور قواعد و ضوابط کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیا۔ پورے ملک میں مدارس کا جال بچھا دیا۔ شام ایسے پسماندہ ملک میں تعلیم کو بے پناہ فروغ دیا۔ یتیم خانے قائم کیئے۔ مذہبی تبلیغ اور اشاعتِ اسلام

کا بندوبست کیا۔ پہلی جنگِ عظیم میں بھی انہوں نے ترکی کی شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ جس کی وجہ سے انہیں امورِ ریاست و حکومت کا کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ جمہوری حکومت قائم ہونے کے بعد خالدہ ادیب خانم نے بے شمار سکولوں، تربیت گاہوں اور کالجوں کے علاوہ انقرہ میں ایک یونیورسٹی قائم کی۔ لڑکیوں کے لیے ڈاکٹری، سائنس، انجینئرنگ اور قانون کی تعلیم کا انتظام کیا۔ جولائی ۱۹۲۱ء میں جب یہ اطلاع ملی کہ یونانی فوج انقرہ پر حملہ کرنے والی ہے تو پوری ترک قوم ایک بار پھر اس کی مدافعت کے لیے تیار ہو گئی۔ خالدہ خانم نے رسد، بار برداری، تیمارداری اور دوسرے کاموں کے لیے ترک عورتوں کی ایک فوج قائم کی۔ جس میں ہزاروں عورتیں شامل ہو گئیں۔ وزارتِ دفاع نے ان کی عسکری تربیت کا انتظام کر دیا۔ عورتوں کے دستے، پلوں، تار گھروں، ریلوے سٹیشنوں اور نشر گاہوں کی حفاظت کے لیے متعین ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ زنانہ فوج کے ایک دستے نے اسمر کے علاقے میں یونانیوں پر کئی کامیاب شب خون مارے۔ جب ستمبر ۱۹۲۱ء میں یونانیوں نے بہت بڑا حملہ کیا تو خالدہ اپنے زنانہ دستوں کے ساتھ محاذِ جنگ پر موجود تھیں۔ مشہور ہے کہ خالدہ خانم سیاہ عمامہ پہن کر میدانِ جنگ میں جاتیں تو فوجوں میں بے پناہ جوش پیدا ہو جاتا۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں ان کے شوہر ڈاکٹر عدنان قسطنطنیہ کے گورنر مقرر ہوئے تو ان کے ساتھ وہاں مقیم ہو گئیں اور انہوں نے اپنا تمام وقت ترک قوم کی بے لوث خدمت میں صرف کیا۔

حورِ عین

فاطمہ بنت عبداللہ

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی! تیری قسمت میں تھی
غازیانِ دین کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

(اقبال)

فاطمہ بنت عبداللہ

پہلی جنگ عظیم کے وقت طرابلس بھی دوسرے عرب ممالک کی طرح ترکی خلافت کے زیرِ نگین تھا۔ اس علاقے کے صحرا نشین عرب اس وقت بھی قدیم اسلامی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ ان کی زندگی سادگی، جفاکشی، اسلام دوستی اور خلوص و مروّت کا ایک حسین و جمیل مرقع تھی۔ اس وقت بھی جب دنیا بھر میں تمام بڑی چھوٹی طاقتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے سیاست کے نام پر مکر و فریب کے جال پھیلا رہی تھیں۔ یہ سیدھے سادے اور بہادر لوگ اللہ اور اس کے رسول کے نام پر پروانہ وار اپنی جانیں نچھاور کرنا زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے اور اسلام کی عظمت کے لیے کٹ مرنا ان کے نزدیک سب سے بڑی عبادت تھی۔ قبائلِ طرابلس میں البراعصتہ قبیلہ اثر و رسوخ اور کثرتِ افراد کے لحاظ سے بہت ممتاز خیال کیا جاتا تھا۔ اس قبیلے کے سردار شیخ عبداللہ جو وہاں کے باشندوں میں عبدہ کے نام سے مشہور تھے بے حد نیدار بہادر اور مخلص مسلمان تھے۔ شیخ اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ ان کے ہاں صرف ایک بیٹی فاطمہ تھی جسے وہ بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ فاطمہ طرابلس کے اسی صحرائی ماحول میں پرورش پا رہی تھی۔ اس کے ماں باپ کو اسلام سے جو والہانہ شیفتگی اور محبت تھی فاطمہ اس کی ایک معصوم اور دلکش تصویر تھی۔ ۱۹۱۲ء میں جب طرابلس پر جنگ کے مہیب بادل چھا گئے اور اطالوی فوجوں نے ان رجز خوانی سے معمور صحراؤں کو آتش و خون کے لرزہ خیز تماشوں سے جہنم زار بنا دیا تو اس وقت فاطمہ کی عمر گیارہ سال کے قریب تھی

خلافتِ ترکی طرف سے جہاد کا اعلان کیا جا چکا تھا چنانچہ شیخ عبداللہ نے طرابلس کے تمام عرب قبائل کو متحد اور منظم کر کے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں لا کھڑا کیا۔ شیخ عبداللہ کی دعوت پر اندرونِ صحرا تک کے قبائل اپنی قدیم روایات کے مطابق اہل و عیال سمیت شریکِ جنگ ہو گئے۔ ہر قبیلے کے ساتھ اس کا پورا خاندان محاذِ جنگ پر موجود تھا۔ عورتوں میں عمر رسیدہ خواتین سے لے کر کمسن لڑکیاں تک سب شامل تھیں۔ جو شوقِ جہاد کے نشے سے سرشار مجاہدین کی خدمت کر رہی تھیں۔ اس جنگ کے مبصرین نے لکھا ہے کہ عرب فوج کے ساتھ بچوں والی مائیں بھی موجود تھیں جن کے سرفروشانہ جذبات کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف گود میں بچہ اٹھائے تھیں تو دوسری طرف مشکیزہ سنبھالے زخمی مجاہدین کو پانی پلاتی پھر رہی تھیں۔ چاروں طرف سے گولیوں کی بارش ہو رہی تھی اور بموں کے خوفناک دھماکوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مگر ان نشہ شہادت میں چور خواتین کے چہروں پر خوف و ہراس کی کوئی علامت نظر نہ آتی تھی۔ ان تمام مجاہدانہ سرگرمیوں کا سہرا ایک حد تک شیخ عبداللہ کے سر تھا کیونکہ وہی عرب مجاہدین کی قیادت کر رہے تھے۔ شیخ اس درجہ مخلص اور بے ریا شخص تھے کہ انہوں نے وہ روزینہ قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا جو سلطان ترکی کی طرف سے ایامِ جنگ میں عربوں کو دیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنا تمام مال و اسباب ترک افسروں کے سپرد کر دیا تھا تاکہ مجاہدین کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ یوں تو دوسرے قبائل کے ساتھ شیخ عبداللہ کا تمام خاندان جہاد میں مصروف تھا مگر ان کی اکلوتی گیارہ سالہ بچی فاطمہ اپنے بے پناہ ذوق و شوق، جرأت و دلیری اور محویت و استغراق کی وجہ سے تمام ترک فوجی افسروں کے لیے باعثِ حیرت بنی ہوئی تھی۔ ایک ترک افسر ڈاکٹر اسماعیل ثناتی بک نے جنگ کے چشم دید حالات بیان کرتے ہوئے اس ننھی مجاہدہ کے متعلق لکھا ہے۔

"سب سے پہلے میں نے اس معصوم بچّی کو اس وقت دیکھا جب میں پہلی دفعہ اپنے ساتھیوں سمیت عزیزیہ سے زوارہ میں وارد ہوا تھا۔ یوں تو فوج میں عورتوں اور لڑکیوں کی کمی نہ تھی کیونکہ ہر عرب اپنے تمام خاندان سمیت جہاد میں شریک تھا مگر فاطمہ میں چند ایک ایسی خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے وہ ہزاروں مردوں اور عورتوں میں علیحدہ پہچانی جاتی تھی۔ ایک تو وہ بہت کم عمر تھی۔ دوسرے اسے جنگ کے ہنگاموں اور زخمی مجاہدین سے کچھ ایسی محبت ہو گئی تھی کہ انتہائی خوفناک معرکوں میں بھی ہر سپاہی اسے محاذِ جنگ پر اپنے آگے ہی دیکھتا تھا۔ جنگ خواہ حملے کی صورت میں ہو یا مدافعت کی شکل میں، ساحلی بیڑے سے گولوں کی بارش ہو رہی ہو یا تلواروں اور سنگینوں کی باڑیں سامنے ہوں۔ مگر ایک زخمی مسلمان کی آہ میں اس معصوم بچّی کے لئے ایسی کشش تھی کہ وہ اپنی چھوٹی سی مشک سمیت اس جگہ پہنچ کر اپنا فرض انجام دینا کبھی نہ بھولتی تھی۔

اس کے دل میں ایک ایسا عشق تھا جس کی عمر اس کی اپنی عمر سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ لہو و لعب یا کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لئے نہ تھا بلکہ خون، زخم اور کٹی ہوئی انسانی رگوں کا عشق تھا۔ جہاں کہیں یہ چیزیں موجود ہوتی تھیں وہ بادِ صبا بن کر برق رفتار ہرنی کی سی تیزی مگر فرشتۂ عشق کے پروں سے اڑتی ہوئی وہاں پہنچ جاتی۔ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ بارود کے دھوئیں سے تمام فضا تاریک ہو رہی تھی۔ توپوں کی گھن گرج سے کانوں کے پردے پھٹ رہے تھے۔ گولوں کے پھٹنے سے ایک عارضی روشنی نمودار ہو جاتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی دردناک انسانی چیخیں پچھلی مہیب گرج اور کڑک کے ساتھ مل کر ایک عجیب وحشت انگیز سماں پیدا کر دیتی تھیں۔ ایسے جگر پاش

[illegible]

[illegible]

نے خوب جی توڑ کر مقابلہ کیا اور دشمنوں کو بارہ سولاشیں میدانِ جنگ میں چھوڑ کر ساحل کی طرف پیچھے ہٹنا پڑا۔ دوپہر کے وقت جب کہ اطالوی توپ خانہ دو طرف سے لگاتار گولے برسا رہا تھا اور بیک وقت ہزاروں بندوقیں چلنے کی دہشت ناک آواز سے فضا لرز رہی تھی۔ ریگ زارِ طرابلس میں موت اور ہلاکت کے علاوہ کوئی دوسری چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس وقت وہ حورعین، فاطمہ بنت عبداللہ بڑی تن دہی اور دلیری سے اپنے کام میں مصروف تھی۔ اس کا فرشتوں کے تقدس کو شرما دینے والا معصوم چہرہ دھوئیں اور تپش سے جھلس چکا تھا۔ اور بالوں پر سرخی مائل ریت کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے خون کے جابجا دھبوں سے سرخ ہو رہے تھے اور وہ چھوٹی سی مشک پیٹھ پر اٹھائے فضائے جنگ میں پروانہ وار اڑتی پھر رہی تھی۔ اس کی محویت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا کے تمام رشتوں اور بندھنوں سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ اسے نہ ماں باپ کا غم ہے اور نہ اپنے اعزہ و اقربا کا کوئی خیال ہے۔ وہ تمام خیالات سے یکسر خالی اپنی دھن میں غازیانِ دین کی سقائی میں مصروف تھی۔ عصر کے قریب مجاہدین نے بڑے جوش و خروش سے اطالویوں پر حملہ کیا اور پیش قدمی کرتے ہوئے دشمنوں کی صفوں کے اندر گھس گئے۔ بندوقیں بیکار ہو گئیں۔ تلواروں اور سنگینوں سے انسانی اعضا کٹ کٹ کے ٹکڑے ہو کر گرنے لگے۔ ایک ترک کمان افسر احمد نوری بک نے عربوں کو یوں لڑتے دیکھا تو وہ اپنے مٹھی بھر جاں نثاروں کو لے کر بڑھتا ہوا دشمنوں کے مشرقی توپ خانے تک جا پہنچا۔ جہاں تازہ دم اطالوی فوج موجود تھی۔ ان اطالوی سپاہیوں نے ترک مجاہدین کو گھیر کر چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ خدا معلوم ننھی مجاہدہ فاطمہ عرب سپاہیوں کی صفوں سے اتنی دور کیسے پہنچ گئی۔ اس نے دیکھا کہ کچھ ترک مجاہدین لڑتے ہوئے اطالوی سپاہیوں کے گھیرے سے باہر نکل آئے ہیں مگر چار زخمی ترک زمین پر پڑے سسک رہے ہیں اور بزدل اطالوی ان کے سروں اور سینوں کو اپنی سنگینوں سے چھلنی کر کے غصہ فرو کر رہے ہیں۔

یہ دردناک منظر دیکھ کر گیارہ برس کی یہ ننھی مجاہدہ ایک نڈر اور بے خوف سپاہی کی طرح ان کے گھیرے میں چلی گئی۔ اس نے اطالوی سپاہیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا کیونکہ اس کی بے تاب نظریں تو ان زخمی مسلمانوں پر مرکوز ہو چکی تھیں۔ فاطمہ نے جلتے ہی اپنی مشک ایک تڑپتے ہوئے زخمی کے منہ سے لگا دی۔ ابھی زخمی کے حلق میں پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں پہنچا ہو گا کہ دو اطالوی سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ فاطمہ نے چھڑانا چاہا مگر ان کی گرفت بہت سخت تھی۔ وہ یہ بے بسی برداشت نہ کر سکی کہ ایک مسلمان اس کی آنکھوں کے سامنے تڑپ رہا ہو اور وہ اس کی تشنگی نہ بجھا سکے فاطمہ نے غصے میں آ کر ایک زخمی سپاہی کی پڑی ہوئی خون آلود تلوار اٹھا کر اس زور سے ایک اطالوی سپاہی پر دے ماری کہ اس کے ہاتھ کا پنجہ زخمی ہو کر لٹک گیا۔ معاً گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور ایک ہلکی سی چیخ فضا کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب جنگ و جدل کا یہ ہنگامہ فرو ہوا اور اطالوی شکست کھا کر بھاگے تو دشمنوں کا تعاقب کرنے والے عرب اور ترک سپاہیوں نے ایک عجیب اندوہناک منظر دیکھا کہ چار ترک سپاہی زخموں سے چور زمین پر پڑے ہیں اور ان کے قریب اس حور عین فاطمہ کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش اس حالت میں پڑی ہے کہ اس کی چھوٹی سی مشک ایک بے ہوش ترک کے سینے پر رکھی ہے اور مشک کا حلقہ فاطمہ نے بدستور مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے معلوم ہوتا تھا کہ اس بے مثال مجاہدہ نے گولیاں کھانے کے بعد بھی زخمی مسلمان کو پانی پلانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ مگر اس کا ہاتھ زخمی کے منہ تک نہ پہنچ سکا تھا۔

مبارک ہے وہ قوم جس کے آغوش میں ایسی قابل فخر بیٹیاں تربیت حاصل کرتی ہیں۔ اور مبارک ہیں وہ ماں باپ جن کے خون جگر سے اس طرح اسلام کی آبیاری ہوتی ہے صحرا کی اس بہادر بیٹی نے کسی کنڈر گارٹن اسکول میں تعلیم حاصل نہ کی تھی اور نہ اسے ناز و نعم کے وہ اسباب میسر رہے تھے جن سے ہمارے بچے بہرہ ور

ہوتے ہیں مگر انہیں دین کی عظمت کا احساس تو بڑی چیز ہے اس کی ابجد کا بھی علم نہیں ہوتا۔

وہ ایک غیور اور بہادر مسلمان باپ کی بیٹی تھی جس نے اپنی زندگی اللہ کے دین کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ فاطمہ کی رگوں میں اسی غیرت مند باپ کا خون موجزن تھا۔ اس نے اپنے خاندان کی شجاعت اور دلیری ورثے میں پائی تھی اسلام کی محبت اس کی گھٹی میں شامل تھی۔ اس لئے وہ جانتی تھی کہ آزمائش و ابتلاء کے ایسے دور میں ایک مسلمان بیٹی کو کیسا کردار ادا کرنا چاہیئے۔ اس معصوم شہیدہ کے ماں باپ اس کے منہ سے لچر اور بے ہودہ گانے سن کر خوش نہ ہوتے تھے۔ بلکہ انہوں نے اپنی بیٹی کو اسلام کی عظمت، اللہ کی وحدانیت و کبریائی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک تعلیم کے نغمات حفظ کرا رکھے تھے۔ اس کا دل کعبۃ اللہ کی طرح مقدس اور پاک تھا۔ اس چھوٹے سے گھر میں اللہ کی محبت اور عشق رسول کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اسے اپنی قوم کی ناموس کا احساس تھا اور اپنے وطن کے ریگزاروں میں مدفون عظمت کا پورا علم تھا۔ ایک گیارہ سالہ بچی جانتی تھی کہ اسلام کے زخمی فرزند جہنم کی طرح تپتی ہوئی ریت پر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے ہوں تو اس کا کیا فرض تھا۔ خدا کی قسم! اس حور عین پر تمام دنیا کے ناز پروردہ بچے نچھاور کئے جا سکتے ہیں اور طرابلس کی سرزمین ہی نہیں بلکہ تمام ملتِ اسلامیہ فاطمہ پر فخر کر سکتی ہے۔ اور بجا طور پر یہ دعوٰے کر سکتی ہے کہ جس قوم کے گنجینۂ اوصاف میں فاطمہ ایسے لعل و گہر ہوں وہ قوم کبھی دنیا سے نہیں مٹ سکتی۔ وہ جب بھی بیدار ہوگی۔ تاریخ اس کے اشاروں پر حرکت کرنے کے لئے مجبور ہو جائے گی۔

مسلمان ماؤں کو سوچنا چاہیئے کہ اس معصوم فاطمہ بنت عبداللہ کا پاک خون انہیں کیا پیغام دے رہا ہے۔ اس ننھی شہیدہ کی مقدس خاک آج بھی ان سے کس چیز کا

مطالبہ کر رہی ہے؛ اس کی روح جب فردوس کی کھڑکیوں سے جھانک کر دنیا پرست بوڑھیوں، خدا فراموش اور خود پرست دوشیزاؤں، بزدل اور عیش پرست ماؤں اور لہو و لعب کی زہریلی فضا میں پرورش پانے والی ننھی منھی بیٹیوں کو دیکھتی ہوگی تو اسے کتنا صدمہ ہوتا ہوگا۔

فاطمہ کی شہادت آج بھی پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

شرف النساء حصّہ اوّل

اخبارات و رسائل کی نظر میں

۱۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور (مورخہ ۸ر جون ۱۹۵۹ء)

شرف النساء (حصہ اول) از عنایت عارف۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ اچھا مجلد معہ سہ رنگی گردپوش۔ ضخامت ۱۷۱ صفحات۔ قیمت تین روپے بارہ آنے۔
ناشر المکتبۃ العلمیہ ۱۵ لیک روڈ لاہور۔

عنایت عارف صاحب نے یہ کتاب اس جذبہ کے تحت لکھی ہے کہ کسی قوم کی عظمت اور سربلندی کا راز اور اس کے افراد کی اخلاقی تربیت اور ترقی کے گر اس قوم کے بزرگوں اور بلند کردار ہستیوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ دیباچہ میں فاضل مؤلف نے بتایا ہے کہ میں نے پاکباز خواتین اسلام کی سیرت کا یہ مجموعہ اس خیال سے مرتب کیا ہے کہ شاید کبھی ہمارے برادران ملت اپنی ضرورت کو محسوس کر کے ادھر بھی توجہ دیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ ارفع و اعلٰے زندگی کے اسرار و رموز کا خزانہ خود ان کے اپنے گھر میں موجود ہے ممکن ہے کہ کبھی خداوندان مکتب کو وقت یہ محسوس کرائے کہ سیرت و کردار کی تعمیر بلند سیرت اور بے داغ کردار کی روشنی حاصل کرنے ہی سے ممکن ہے۔

ابتداء میں پیغمبرانِ عظام کی مقدس خواتین کا تذکرہ ہے جن میں قابلِ ذکر حضرت حوا حضرت ہاجرہ، حضرت سارہ، حضرت صفورا اور ملکہ سبا بلقیس اور حضرت مریم ہیں۔ ازاں بعد امہات المومنین کے حالاتِ زندگی دیئے گئے ہیں۔ پھر بنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثوم۔ سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراؓ، رسولِ اکرم کی نواسی حضرت امامہ اور صحابیات کے سوانح اجمالاً پیش کئے گئے ہیں۔ ان قابلِ احترام خواتین کی سیرت و کردار اور مسلمان عورتوں کیلئے تابندہ شمع راہ ہے اور وہ ان کو اپنا کر اپنی زندگیاں سنوار سکتی ہیں اور اس کا مطالعہ مسلمان خواتین خصوصاً طالبات کے لئے یقیناً ایمان افروز ہوگا۔

عنایت عارف صاحب نے جناب ہاجرہ کا نام ہاجر لکھا ہے حالانکہ ہاجر مذکر ہے۔ اسی طرح سارہ کو سارا لکھا ہے۔ سارا انگریزی تلفظ ہے۔ صفورا بھی عربی قاعدہ کی رو سے صفورا ہے۔

یہ حصہ اول ہے ہمیں توقع ہے کہ فاضل مؤلف حصہ دوم بھی جلد سے جلد مکمل کرینگے

۲۔ روزنامہ امروز لاہور (مورخہ ۷ جون ۱۹۵۹ء)

مصنف : عنایت عارف ۔ قیمت ۔ تین روپے بارہ آنے

صفحات : دو سو بہتر ۔ ناشر ۔ المکتبۃ العلیہ ۵۔ لیک روڈ لاہور

شرف النساء (حصہ اول) تاریخ کی مقدس خواتین کے مختصر سوانح حیات کا مجموعہ ہے اس کتاب میں حضرت حوا، حضرت سارہ، حضرت ہاجرہ۔ حضرت بلقیس زوجہ حضرت ایوب علیہ السلام، حضرت آسیہ بنت مزاحم، حضرت ام سلمہ اور دیگر متعدد خواتین کے اوصافِ حمیدہ کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ مصنف کے اپنے قول کے مطابق اس موضوع پر پہلے بھی بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ جن سے انہوں نے استفادہ بھی

کیا ہے۔ مگر اس مجموعہ میں انہوں نے تاریخی اور مذہبی کتب کی مدد سے ہر دور کی نیک سیرت خواتین کے حالات یکجا کر دیئے ہیں۔ مصنف کا مقصد دور حاضر کی لڑکیوں کے لیئے ہدایت اور راہنمائی کا ذریعہ فراہم کرنا ہے۔ تاکہ ہماری بچیوں کے سامنے بلند سیرت اور بے داغ کردار کی حقیقی مثالیں موجود ہوں۔ اور وہ ان کی روشنی میں اپنی سیرت و کردار کی تعمیر کر سکیں۔ اس لحاظ سے ان کی یہ کوشش بڑی مستحسن ہے۔ مگر انہوں نے اپنے ابتدائی دیباچے میں یورپ کی مادی اور لادینی تہذیب کو ہر لحاظ سے غیر فطری اور مصنوعی قرار دینے میں اپنی رائے کا توازن برقرار نہیں رکھا۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ سیرت و کردار کی تعمیر میں پاکباز خواتین کے سوانح سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ مگر یہ تعمیر اس طرح ہونی چاہیئے کہ جدید علوم کی روشنی حاصل کرنے کے بعد بھی اس کی چھاپ قائم رہے علوم جدیدہ سے دور بھاگنے اور علیحدگی اختیار کرنے سے اس دور میں کسی بچے کی شخصیت کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ البتہ نئے علوم اور روایتی انسانی صفات کے رشتے میں ایسا توازن ضرور رہنا چاہیئے کہ نئے خیالات بنیادی انسانی صفات کو مسخ نہ کر سکیں۔ شرف النساء کے مطالعہ سے ہمارے ملک کی پڑھی لکھی لڑکیاں پاک باز اور جری خواتین کی سیرت کی پختگی کا اندازہ کر سکیں گی۔ بہت سے والدین اس کتاب کو اپنے بچوں کے لیئے اچھا تحفہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے۔
کتاب کی لکھائی چھپائی عمدہ اور سائز بڑا ہے۔

۳۔ روزنامہ کوہستان لاہور (مورخہ ۵ر جولائی ۱۹۵۹ء)

مصنفہ:۔ عنایت عارف قیمت:۔ ۲ روپے ۱۲ آنے
ناشر:۔ المکتبۃ العلیہ ۱۵ لیک روڈ۔ لاہور

کتاب کے نام سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک خاتون کا تذکرہ ہے

کوئی قوم پیش نہیں کر سکی۔ جن کی زندگیاں سراپا نور تھیں، جن کی بے داغ سیرت اپنی صنف کے لئے اس دور میں بھی روشنی کا مینار تھی۔ اور آج کے دور میں بھی سرچشمۂ حیات ہے۔

کتاب چار عنوانات پر مشتمل ہے

(۱) پیغمبران عظام کی مقدس خواتین (۲) امہات المومنین (۳) بنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (۴) صحابیات۔

پہلے عنوان کے تحت جن مقدس خواتین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ان کی زندگی کے متعلق محض اشارے پائے جاتے ہیں اس لئے مصنف نے توراۃ اور بائیبل کی روایات سے خوشہ چینی کی ہے اور غالباً یہی اس کتاب کا (تاریخی اسناد کے اعتبار سے) کمزور حصہ ہے۔ باقی تینوں عنوانات کے تحت جن واجب الاحترام اور مقدس خواتین کی زندگی کے مرقعے پیش کئے گئے ہیں۔ ان کے ماخذ تاریخ کے مستند ترین ذرائع ہیں چنانچہ ان دونوں میں بیّن فرق محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مصنف نے اپنے قلم سے ان مقدس ہستیوں کے نقوشِ زندگی کھینچنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہر قصہ کے اختتام پر وہ اسباق بھی بیان کر دیئے ہیں۔

۵۔ ہفت روزہ قندیل لاہور (مورخہ ۱۲ جون ۱۹۵۹ء)

اس کتاب کے چار ابواب ہیں پہلے باب میں پیغمبران عظام کی مقدس بیویوں — مثلاً حضرت حوا، حضرت ہاجرہ، حضرت سارہ، حضرت صفورہ، ملکہ سبا بلقیس اور حضرت مریم کا تذکرہ ہے۔ دوسرے باب میں امہات المومنین کے حالات زندگی دیئے

گئے ہیں۔ تیسرے باب میں بنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ، سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراؓ اور رسول اکرم کی نواسی امامہ کی زندگیوں کے حالات ہیں۔ آخری باب میں صحابیات کے مختصر حالات درج ہیں۔

اس کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ میں نے پاکباز خواتین اسلام کی سیرت کا یہ مجموعہ اس خیال سے مرتب کیا ہے کہ شاید کبھی ہمارے برادران ملت اپنی ضرورت کو محسوس کر کے ادھر بھی توجہ دیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ ارفع و اعلےٰ زندگی کے اسرار و رموز کا خزانہ خود ان کے گھر میں موجود ہے۔ ممکن ہے کہ کبھی خداوندان مکتب کو کسی وقت یہ محسوس کرائے کہ سیرت و کردار کی تعمیر بلند سیرت اور بے داغ کردار کی روشنی حاصل کرنے ہی سے ممکن ہے۔

ہمارے ہاں اس وقت ماضی سے جو بے تعلقی کی رو چل نکلی ہے اس سے بچنے کیلئے یہ کوشش قابلِ قدر ہے۔ ہماری نوجوان خواتین کو ایسی کتابوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی سیرت و کردار کو اسلام کی پاکباز خواتین کے عمل کی روشنی میں سنوار سکیں۔

کتاب کے ابتدا میں فہرست نہیں ہے جس کی ایک کمی کا احساس ہوتا ہے حالانکہ فہرست کا ہونا ازبسکہ ضروری تھا۔ تاکہ قاری ایک نظر میں کتاب کے مندرجات کو جان سکتا۔

۶۔ ہفت روزہ چٹان لاہور (مورخہ ۲۰؍ جولائی ۱۹۵۹ء)

عورت نصف انسانیت اور چمنستان زندگی کی بہار ہے۔ یہ نہ ہو تو کائنات ایک اداس ویرانہ بن جائے۔ عورت کے مقدس رشتے چار ہیں، یعنی وہ بیٹی ہے، بہن ہے، بیوی ہے اور ماں ہے وہ اگر ان مقامات میں اچھی سیرت اور بلند کرداری کا دامن تھامے رکھے تو نہ صرف خود زندگی کی معراج پالے، بلکہ اپنے گرد و پیش کو بھی اسی سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔

انسان کا سب سے پہلا مکتب آغوشِ مادر ہے، وہ قوم عظمت کی بلندیوں کو کیوں نہ

چھوڑے گی جس کے نونہالوں کو اس مکتب میں بلند اخلاق اور پختگی کردار کی تعلیم ملتی ہو۔ تاریخ کا رخ موڑنے اور حالات کے بدلنے والے لوگوں کی صلاحیتیں بہت حد تک ماں کی تربیت ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

ہماری تاریخ کو ایسی متعدد خواتین کے نام ازبر ہیں جنہوں نے سیرت و کردار کے نمونے قائم کئے اور مثالی زندگیاں بسر کیں ــــ جناب عنایت عارف کی تالیف "شرف النساء" انہی خواتین کے حالات پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے کچھ پھول جمع کر کے ایک گلدستہ تیار کیا ہے۔ واضح الفاظ میں پیغمبران عظام کی مقدس خواتین امہات المومنین بنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابیات کے حالات اختصار کے ساتھ اس کتاب میں جمع کر دیئے ہیں۔ پاکباز خواتین اسلام کی زندگیاں ہماری خواتین کے لئے نمونوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ وہ زندگی کے تمام مراحل میں ان نمونوں کو سامنے رکھیں اور ان روایتوں کو زندہ کر دیں جو قصہ پارینہ بن چکی ہیں۔

انداز تحریر کی سادگی اور دلپذیری نے کتاب کو بیحد جاذب اور پرلطف بنا دیا ہے۔ ہر قصہ کے آخر میں جو تبصرہ کیا گیا ہے وہ اس قسم کی دوسری کتابوں میں نہیں ملتا۔ طباعت و کتابت عمدہ ہے

ارکانِ اسلام

مرتبہ : عبید الحق

- اس کتاب میں عقائد اور نماز، روزہ، حج، زکاۃ کے تمام مسائل نہایت آسان زبان اور شگفتہ انداز میں شرح و بسط سے بیان کیے گئے ہیں۔ اسلوبِ تحریر نہایت شگفتہ، رواں اور بچوں کی افہام و تفہیم کے لئے بہت ہی موزوں ہے۔
- کتاب میں جا بجا احکام قرآنی اور ارشادات نبوی کے حوالے بامحاورہ ترجمہ کے ساتھ دیئے گئے ہیں
- بچوں اور بڑوں دونوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ یکساں مفید ہوگا۔
- کتابت و طباعت دیدہ زیب ● کاغذ سفید
- مجلد ● سہ رنگا گرد پوش
- صفحات ——— ۵۶۰
- قیمت ——— ۵/-/- روپے

المکتبۃ العلمیہ ۔ ۱۵ لیک روڈ ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شرف النساء

حصہ دوم

مصنفہ

عنایت عارف

ناشر

المکتبۃ العلمیہ - ۱۵ لیک روڈ - لاہور